اِذَا رَاَیتَ الَّذِینَ یَخُوضُونَ فِی اٰیٰتِنَا فَاَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ

علیکم بدین العجائز

تروی هٰذهِ الاشیاء یؤمن بها ولا یقال کیف

مذہب و عقلیات

یعنی

لکچر جو جناب مولانا عبد الباری صاحب ندوی پروفیسر احمد آباد کالج (گجرات) نے آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس سورت منعقدہ دسمبر ۱۹۱۸ء میں دیا اور جس میں مذہب و عقلیات کی اختلاف نوعیت اور تباعدیت کی توضیح و تشریح کر کے بتایا گیا ہی کہ عقل و مذہب کے مابین تطبیق کی کوشش ایک سعی لاحاصل ہی

حسب فرمایش

عالی جناب آنریری جوائنٹ سکرٹری صاحب کانفرنس

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ کالج میں طبع ہوا
۱۳۳۸ھ ۱۹۱۹ء

واز صدر دفتر کانفرنس سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

جس قسم کا یہ مضمون ہی، اس طرح کی بحثوں کے لیئے بڑی بڑی کانفرنسوں کی جگہ
چھوٹی چھوٹی مخصوص صحبتیں زیادہ موزوں ہوتی ہیں۔ مگر "المامور معذور"!
مخدومِ محترم مولنا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کے حکم سے، آل انڈیا محمدن
ایجوکیشنل کانفرنس کے بھرے پنڈال میں، مذہب و عقلیات کے موضوع پر تقریر کرنی پڑی
لیکن بڑوں کے حکم میں کوئی نہ کوئی بھلائی نکل ہی آتی ہی۔ کانفرنس کے عام پروگرام

کے سلسلہ میں اتمام بحث کے لیئے کیسے گنجایش نکل سکتی تھی۔ چنانچہ آدھی بات بھی نہ پوری ہونے پائی۔ اِس مجمع عام میں کچھ اربابِ نظر بھی تھے، جن کو اس بحث کی اہمیت نظر آئی، اور قلمبند کرنے پر اصرار کیا گیا۔ میر مجلس (سر ابراہیم رحمت اللہ) نے تو یہاں تک زور دیا، کہ اس کو انگریزی میں بھی ضرور آنا چاہیئے۔

غرض اِس طرح جو چیز صرف زبان تک رہنے والی تھی، وہ اب صفحاتِ کاغذ پر پیشکش ہی۔ "مذہب و عقلیات" کے باہمی تعلق کی نسبت جن غلط فہمیوں کے دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہی، تحریر میں آجانے سے نہ صرف اُن کے حاضر سے غائب تک پہنچنے میں سہولت ہوگی، بلکہ لوگوں کو زیادہ سنجیدگی سے غور و فکر کا موقع ملیگا۔

تاہم آیندہ کے لیئے کانفرنس کے اہلِ حل و عقد سے گزارش ہی کہ اگر کوئی خالص علمی مضمون پروگرام میں شامل ہو تو اُس کے لیئے عام کارروائیوں کے سلسلہ سے الگ کوئی فرصت نکالنی ضرور ہی۔

لکھنے کے بعد قدرۃً مواد و ترتیب دونوں میں بہت کافی فرق ہو گیا ہی، اس لیئے کہ تقریر کے وقت تقریر ہی کے لایق صرف کچھ یادداشتیں باقی تھیں۔

گجرات کالج۔ احمد آباد   عبدالباری ندوی

نومبر ۱۹ئہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لکچر[1]

"مذہب و عقلیات"

بر

بہ اجلاس محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ سورت دسمبر سنہ ۱۹۱۸ع

حضرات، اُردو زبان ابھی اس درجہ تک نہیں پہنچی ہے کہ کسی سنجیدہ اور گہرے مضمون کو اس میں عام فہم بنایا جا سکے۔ دوسری بدبختی یہ ہے کہ نئی تعلیم و روشنی کے دوستوں کو اپنی زبان سے اسقدر بے نیازی ہے کہ غیر زبانوں پر توصحت و زندگی تک کو قربان کر دیتے ہیں، لیکن اُردو کے لیئے ایک گوشۂ چشم کے بھی روادار نہیں۔ معمولی خط تک صحیح طور پر نہیں لکھ پڑھ سکتے۔ دکن و گجرات کا پلیٹ فارم اُردو مقرر کے لیئے اور بھی بیگانہ ہے، یہاں کے حالات مسلمانوں کو اپنی مشترک زبان سے آشنا بھی آشنا نہیں ہونے دیتے، جتنا بنگال و پنجاب والے ہیں اس لیئے

[1] یہ لکچر چونکہ بالکل زبانی تھا اس لیے حوالوں کے محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ بعد کو قلم بند کرنے پر اصرار ہوا۔ اِس اصرار کی تعمیل کے وقت بعض کتابیں پاس نہیں موجود ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں ماخذ و صفحات کے حوالے نہیں دیئے جا سکے ہیں۔

اگر آپ حضرات کی توجہ اور دلچسپی کو میں نہ حاصل کرسکوں، تو اس کی جواب دہی تمام تر میرے محترم بزرگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی پر ہے، جنھوں نے باوجود عذر خواہی کے اپنے امر کو واپس لینا نہ قبول فرمایا ؎

اُمید ہست کہ بیگانگیٔ عرفی را
بدوستی سخنہائے آشنا بخشند

موضوع خطاب "مذہب و عقلیات" ہے۔ مذہب سے مراد فوق الفطرۃ (سپر نیچرل) ہستی یا چیزوں کا اعتقاد ہے، جو کسی نہ کسی صورت کے ساتھ تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ عقلیات سے مقصود اس کی دو مختلف شاخیں حکمت (سائنس) و فلسفہ ہے۔

مذہب و عقل کی معرکہ آرائیوں کی داستان یوں تو ہمیشہ کہی اور سُنی گئی ہے، لیکن پچھلی صدی میں عقلیات نے جو ترقی حاصل کی ہے، اُس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ مذہب آخری شکست کھاکر اکھاڑہ سے نکل چکا ہے۔ "ہم (اہل سائنس) نے خدا کی عارضی خدمات کا شکریہ ادا کرکے اس کو سرحد پر پہنچا دیا ہے۔" عجائب سائنس سے ہیبت زدہ اور تقلیدی پرستاران یورپ کے حلقوں میں پہنچکر یہ آوازیں اور زیادہ پُرشور بن جاتی ہیں۔

آغازِ جنگ میں جرمنی کی عجائب کاریوں اور حربی اختراعات نے اِس درجہ مبالغہ آمیز شہرت حاصل کی تھی کہ طلسم ہوش رُبا کے افسانے واقعات و مشاہدات معلوم ہونے لگے تھے۔ ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے بزرگ نے نہایت یقین و سنجیدگی سے بیان کیا کہ جرمنی کی فوج کے تمام سپاہی لوہے اور کاٹھ کی مصنوعی پتلیاں ہوتے ہیں۔ عوام کی نفسی حالت یہ ہو گئی تھی کہ جرمنی کی نسبت بے سوچے سمجھے ہر بے سروپا بات کے مان لینے پر آمادہ تھے۔

میں اس زمانہ میں سلطان پور میں تھا۔ ایک دوست نے اگر چشم دید واقعہ بیان

؎۱ ایک گروہ کا مقولہ ہے۔ دیباچہ مترجم "معمۂ کائنات"۔

گیا کہ ایک اسٹیشن پر مسافر اتر کر جب باہر نکلے، تو کسی ظریف نے نہایت خوف زدہ آواز میں چیخکر کہا کہ "جرمن آگئے" اور بھاگا۔ اتنا سننا تھا کہ بیسیوں آدمی بدحواس ہو گئے اور اسباب چھوڑ چھوڑ کر جدہر سمایا بھاگ کھڑے ہوئے، اِن احمقوں نے اتنا نہ سوچا کہ جرمن یہاں کیوں آنے لگے، یکایک کیسے اور کدہر سے پہنچ گئے، ذرا مڑ کر دیکھ تو لیں لیکن مرعوبیت اور بدحواسی اس کی مہلت کہاں دیتی ہے!!

مذہب و سائنس کی شکست و فتح تو الگ رہی، ہمارے نزدیک اِن کی باہمی جنگ ہی اس سے زیادہ اصلیت نہیں رکھتی، جتنا "جرمنوں" کا اس اسٹیشن پر بے سان گمان آپڑنا ہندوستان میں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ یورپ کی سائنٹفک ایجادات بھی آئیں جن میں سے ہر ایک ریل، تار، الکٹرسٹی وغیرہ اچھے اچھوں کی عقل کو حیران بنا دینے کے لیے کافی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ سائنس نے زمین کو تول کر وزن معلوم کر لیا، روشنی کی شرح رفتار بتا دی، مریخ میں دریا پہاڑ اور آبادی کا سراغ لگا لیا۔ اب جو اسکول اور کالجوں میں ہمارے فرزندانِ تعلیم جدید نے کہیں یہ سن پایا کہ سائنس نے "خدا کو سرحد باہر کر دیا" تو بیچارے سمجھے کہ جو چیز ایسے حیرت انگیز اور سمجھ میں نہ آنے والے معجزے دکھا سکتی ہے جب اسی نے خدا و مذہب کو باطل ٹہرا دیا تو پھر اب کیا رہا۔ اِس مرعوبیت کا آج تک یہ عالم ہے کہ نفس یورپ یا سائنس کا نام لے لینا، کسی بات کے منوانے کے لیئے سب سے مؤثر استدلال ثابت ہوتا ہے۔

غرض برادرانِ اسکول و کالج کو سنجیدگی کے ساتھ "مذہب و عقلیات" کے مطالعہ اور اِن کے باہمی تعلق پر کبھی غور و فکر کی فرصت تو میسر نہوئی، اور نہ یہ سوچا کہ دونوں ایک میدان میں اُتر بھی سکتے ہیں یا نہیں، لیکن عقل و سائنس کی فتح کے نقارچی بن گئے، اگرچہ مصر اور ہندوستان وغیرہ میں یہ دبا زیادہ تر اسی طرح پھیلی، تاہم اس کی ذمہ دار ہمارے نئے تعلیم یافتہ احباب کی تنہا مرعوبیت و نادانی نہیں ہے۔ اور اسباب بھی ہیں، جنھوں نے اس خیال کو عالمگیر بنا دیا۔

۱- اولاً تو بعض ذمہ دار اور سائنس کے اکابر رجال مثلاً لاپلاس، ٹنڈل، ہکسلے وغیرہ کی زبان و قلم سے ایسے الفاظ نکلے کہ عوام کا تو کیا ذکر خواص تک اِس دھوکے اور غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے، کہ مذہب و سائنس کی دشمنی کا خیال کوئی بازاری گپ نہیں ہے۔ لاپلاس نے جب اپنی کتاب (Mecanique Celeste) نپولین کو پیش کی تو اس نے کہا کہ "لوگ کہتے ہیں کہ تم نے یہ کتاب نظامِ عالم پر لکھی ہے، اور پھر بھی اِس کے خالق کا نام نہیں لیا ہے" اس پر لاپلاس نے خشونت کے ساتھ جواب دیا کہ "جناب والا مجکو اس قسم کے کسی فرض کی کوئی ضرورت نہ تھی"

ہکسلے نے یہ کہدیا کہ "مادہ اور توہین مادہ نے عقیدہ خلق (جینسس) اور روح کے وجود کو باطل کر دیا ہے" اِس طرح کی باتوں نے سائنس کی حقیقت سے ناواقفوں کے دل میں اور بھی مذہب کی نسبت وسوسے پیدا کر دیے۔ اور اُن کی مرعوبیت کو گویا ایک سند ہات آگئی۔

۲- لیکن حقیقت میں غلط فہمی کا سب سے بڑا منشا، اہلِ سائنس اور علماءِ مذہب کی عداوت کا مغالطہ ہے، جس کا بہت کچھ ذمہ دار یورپ کا محکمۂ احتساب (انکوئیزیشن) ہے، جس کی قربان گاہ پر قرونِ وسطیٰ میں پاپاؤں کے ہاتھ بیسیوں محققینِ سائنس انکشافاتِ علمی کے گناہ میں نذر چڑھ گئے۔ پادری سمجھتے تھے کہ زمین کا گول کہنا بھی مذہب کی تردید ہے، کوپرنکس نے حرکتِ ارض و مرکزیتِ شمس کے اثبات یا نظامِ فیثاغورس کی تائید میں کتاب لکھی تو اِس کا پڑھنا کفر قرار پایا۔ گلیلیو نے دوربین کی ایجاد سے کوپرنکس کے انکشافات کی تائید کی، تو اِس کو قید کی سزا ملی اور قید ہی میں مر گیا۔ برونو اُس جرم میں جلا دیا گیا کہ "تعدد عوالم" کا قائل تھا۔

غرض اس محکمہ نے سینکڑوں آدمیوں کو مذہب کے نام سے ستایا اور برباد کیا۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ لوگ علم و مذہب کو حریف سمجھنے لگے، اس مغالطہ نے اتنا تسلط

لے "دفطرت دلا ادریت" ازدارڈ صفحہ اول جلد ۴۔

حاصل کیا کہ ڈریپر نے ایک کتاب ہی معرکہ مذہب و سائنس کے نام سے لکھ ڈالی، حالانکہ اُس کا ماحصل تمام تر وہی اہلِ سائنس اور علما، مذہب کا معرکہ ہی۔

۳۔ تیسرا بڑا سبب خود مذہب کے ناداں دوست ہمارے **متکلّمین** ہیں اُنھوں نے اِس پر تو غور نہ کیا کہ مذہب و عقلیات میں اُصولاً کوئی تصادم ہی یا نہیں، اور اِن دونوں کی تطبیق و مصالحت کی اُلجھن میں پڑ گئے، یا پھر حکمۃ و فلسفہ کی زبان سے جو بات بھی نکلی اُس کی تردید اپنا فرض مذہبی قرار دے لیا۔

مسلمانوں میں جس شئے نے عقل و مذہب کی باہمی منافرت کے خیال کو سب سے زیادہ پھیلایا اور رائج کیا وہ یہی **علمِ کلام** کی زیادہ کاری ایجاد ہی، جس نے ایک طرف مذہب کو شدید صدمہ پہنچایا اور دوسری طرف ذہنی قوتوں کو بادپیمائی اور سطحِ آب پر نقش آرائیوں میں رائگاں کیا۔

غرض علم و مذہب کے باہمی عناد و تصادم کا افسانہ جس قدر دراز اور عالمگیر ہی، اس سے بدرجہا زیادہ بے بنیاد و غلط ہی۔ اس صحبت میں اِسی نکتہ کو آپ حضرات کے سامنے واضح کرنا مقصود ہی نہ کہ دونوں میں تطبیق، جیسا کہ بعض احباب کو مقرر کی مولویت سے بدگمانی ہوئی ہی۔ اور جیسا کہ بالعموم عقل و مذہب کے یکجائی استعمال سے لوگ سمجھ بیٹھتے ہیں، خصوصاً جب کسی مذہبی آدمی کی زبان پر یہ الفاظ آجائیں۔ آج صبح ہی ایک تعلیم یافتہ دوست فرمانے لگے، کہ "مذہب تو دیوالیہ ہو چکا ہی، اب دیکھنا ہی کہ تم اُس کی حمایت کیونکر کرتے ہو"

مذہب و سائنس کی بے تعلقی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے اِن کے باہمی فرق اور بُعدِ حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے، ریل کی دو گاڑیاں ٹکرا سکتی ہیں اور ٹکراتی ہیں، لیکن ریل گاڑی اور جہاز میں تصادم ناممکن ہی، اِس لئے کہ ریل سمندر میں چل ہی نہیں سکتی ہی، اور نہ جہاز خشکی پر بعینہ یہی حال سائنس اور مذہب کا ہی۔ سائنس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اُس سے زیادہ محال ہی، جتنا ریل کا پانی یا جہاز کا خشکی پر چلنا ہی۔ مذہب جہاز ہے

شروع ہوتا ہے، سائنس کی رسائی وہاں ختم ہو جاتی ہے، سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے مذہب کا وہ نقطۂ آغاز ہے۔ سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرۃ (نیچر) کے واقعات، مشاہدات اور تجربات سے ہے۔ مذہب کی بنا یکسر فوق الفطرت اور تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے ماوراء چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ۔

ایک عامی آدمی اور سائنٹسٹ کے تجربہ اور مشاہدہ میں اتنا فرق ہوتا ہے، کہ موخرالذکر اپنے مشاہدات و تجربات کو تفتیش اور مختلف قسم کے اختبارات (اکپریمنٹس) سے وسیع کرکے استقرائی (انڈکٹو) کلیات بناتا ہے، اور اُن کی توجیہ و تشریح (اکسپلے نیشن) کے لئے اُصول وضع کرتا ہے۔

ایک راہ گیر بھی سیب کو درخت سے زمین پر گرتے دیکھتا ہے، لیکن نیوٹن کا ذہن اس واقعہ سے ایک وسیع اصول کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے تجربہ کو پھیلاتا ہے، طرح طرح کے اختبارات سے اپنے انتقالِ ذہنی کو مُصدّق و مستحکم بناتا ہے، مختلف واقعات کو ایک سلسلہ میں جوڑتا ہے۔ اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سمندر کے مدوجزر، سیارات کی گردش، نظام شمس کے قیام جیسے عظیم الشان اور مختلف واقعات میں بھی وہی علّۃ و قوۃ کارفرما ہے، جو سیب کے زمین پر گرنے میں۔ اِس قوت کا نام وہ کشش رکھتا ہے جس سے عالمِ جسمانیات کا ایک ایک ذرّہ بندھا ہوا ہے۔ آگے چل کر یہی قانون کشش دنیائے سائنس کا عظیم ترین اکتشاف قرار پاتا ہے۔

لیکن خود یہ قانونِ کشش کیا ہے؟ کیسے وجود میں آیا ہے؟ ازلی ہے یا کسی کا مخلوق؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب میں علمائے سائنس کی زبانیں گنگ ہیں۔ خود نیوٹن کو اپنی اسی کتاب (پرنسیپیا) کے خاتمہ میں جس میں سائنس کے اِس مایۂ ناز اکتشاف پر بحث ہے یہ کہنا پڑا کہ "عالمِ فطرت کی یہ نیرنگیاں واجب الوجود کے ارادہ کے علاوہ کسی اور شئے سے نہیں ظاہر ہو سکتیں۔ وہ واجب الوجود جو ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے، یعنی خدائے برتر نامحدود

قادر مطلق، سمیع و بصیر اور کمال بحت ہستی"۔

مشہور حکیم (سائنٹسٹ) پروفیسر ٹنڈل نے سائنس کی اس حقیقت اور محدود رسائی کو ایک عام فہم تمثیل سے یوں سمجھایا ہی کہ "اگر تم گھڑی دیکھو، تو اُس میں گھنٹے، منٹ اور سکنڈ کی سوئیاں پھرتی نظر آئینگی۔ یہ سوئیاں کیوں پھرتی ہیں؟ اور اُن کی حرکات کی یہ خاص باہمی نسبت جو ہم کو نظر آتی ہی کیونکر قایم ہی؟ اِن سوالات کا جواب بے گھڑی کو کھولے، اُس کے مختلف پرزوں کو اچھی طرح دیکھے اور اُن کا ایک دوسرے سے تعلق معلوم کیئے بغیر نہیں دیا جا سکتا۔ جب یہ سب کچھ ہو لیتا ہی، تو ہم کو معلوم ہو جاتا ہی کہ سوئیوں کی یہ خاص حرکت گھڑی کی اُس اندرونی ساخت اور مشین کا نتیجہ ہی، جو کوک کی قوت سے چل رہی ہی۔ سوئیوں کی یہ حرکت صنعتِ انسانی کا ایک واقعہ یا حادثہ ; فنامنن) کہا جا سکتا ہی، لیکن بعینہٖ یہی حال واقعات و حوادثِ فطرت کا ہی۔ اِن کے اندر بھی ایک مخفی مشین کار فرما ہی، اور ایک خزانۂ قوت ہی، جو اِس مشین کو چلا رہا ہی۔ حکمت طبعی (فزیکل سائنس) کا انتہائی کام اِسی مشین اور ذخیرۂ قوت پر سے پردہ ہٹا کر یہ بتانا ہی کہ یہ واقعات و حوادث اِنہی دونوں کے فعل و انفعال کا لازمی نتیجہ ہیں"۔

لیکن کارخانۂ عالم کی یہ اندرونی مشین خود کیا ہی اور کیسے بنی؟ اِس گھڑی کو کس نے کوکا؟ اِس کی چلانے والی قوت (انرجی) کہاں سے آئی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب سائنس کے بس سے باہر ہی۔ علمی زبان میں یوں کہو کہ سائنس صرف ثانوی اور قریبی علل و اسباب پر سے پردہ اُٹھا کر واقعاتِ عالم کی ایک گونہ توجیہ و تشریح کر سکتی ہی، عللِ اولیٰ کا پتہ لگانا سائنس کے دائرۂ بحث سے قطعاً خارج ہی۔ حکمیات (سائنس) کے ایک بڑے امام ہکسلے نے اِس عجز کا اعتراف "سائنس کی پرائمر" میں جو بچوں کے پڑھنے کے لیئے ہی، اِس طرح کیا ہی کہ "کسی شئے کی بھی کامل توجیہ و تعلیل نہیں ہو سکتی، کیونکہ انسان کا اعلیٰ سے اعلیٰ علم بھی سلسلۂ توجیہ میں آغاز اشیا کی جانب چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

اب تم ہی سوچو کہ خدا یا علتِ اولیٰ کے ابطال و اثبات کا بوجھ سائنس پر ڈالنا کیا سائنس کی حقیقت سے جہل اور "بِمَا لَا یَرْضیٰ بِہِ الْقَائِلُ" نہیں ہے؟

کیا بوالعجبی ہے کہ جس ذمہ داری سے سائنس کی کتاب الجبد اس صراحت کے ساتھ ابا و انکار کرتی ہے اُسی کا ہم اپنے جہل سے اُس کو مدعی بتاتے ہیں! عقل و دانش کے مدعی انسان کی بے عقلی اور گمرہی کا سب سے زیادہ حسرت ناک منظر وہ ہوتا ہے کہ بعض خارجی اتفاقات و حالات کی بنا پر، وہ بہت سی ایسی چیزوں کو مسلم سمجھ بیٹھتا ہے، جو واقعیت کے لحاظ سے اُسی قدر بے سر و پا ہوتی ہیں، جس قدر کہ مشہور و مقبولِ عام ہوتی ہیں۔

سائنس کے ہزاروں طلبہ، اُس کے مختلف شعبوں کی تحصیل کرتے ہیں، اور ایک ایک شعبہ پر بیسیوں کتابیں نظر سے گذرتی ہیں، جن میں ایک باب بھی ایسا نہیں ہوتا، جس میں خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ کے ابطال و اثبات سے ایک سائنٹفک واقعہ و حقیقت کی حیثیت سے بحث ہو۔ پھر بھی یہ غوغا ہے کہ "بے اعتقادی نے اعتقاد کی جگہ لے لی ہے، عقل نے صحیفۂ آسمانی کی، سیاست نے مذہب کی، زمین نے آسمان کی، عمل نے عبادت کی، مادی احتیاج نے دوزخ کی، اور انسان نے دیندار کی[۱]"

بے شک ایک عالم ہیئت اجرامِ سماوی اُن کی باہمی کشش اور قوانین حرکت سے بحث کرتا ہے اور کر سکتا ہے، لیکن کیا وہ اس کشش و حرکت کی ماہیت اور انتہائی علت بھی بتاتا ہے یا بتا سکتا ہے؟ ریاضیات کا ماہر عدد اور مکان (اسپیس) کے علایق کا پتہ لگا سکتا ہے، لیکن کیا وہ مکان کی اصل حقیقت کا بھی کوئی نشان دے سکتا ہے۔ اتنا بھی تو نہیں معلوم کہ یہ کوئی ذہنی شئے ہے یا خارجی۔ علم الحیات کے اکتشافات سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ جاندار اجسام کاربن، آکسیجن، ہائڈروجن، و نائٹروجن سے مرکب ہوتے ہیں، لیکن کیا کوئی حیاتیات کا محقق اس کا سُراغ لگا سکا ہے، کہ ان مختلف مواد کی کیمیاوی ترکیب

---

[۱] "مقدمہ فلسفہ" از پاکسن صفحہ ۳۱۷

و تعامل سے زندگی اور اُس کے افعال احساس و شعور وغیرہ کیونکر اور کیسے پیدا ہو جاتے ہیں۔ عالم کیمیا و طبعیات، سالمات (ایٹمس) برق، برق پارون (الکٹرنس) اور ایتھر کے وجود کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن کیا وہ بجلی اور ایتھر کی حقیقت کے علم کا بھی دعویدار بن سکتا ہے؟ الحاصل علم و حکمۃ کی جس صنف کو بھی دیکھو، یہ بیک نظر معلوم ہو جاتا ہے کہ "توجیہ و تعلیل کا سلسلہ آغاز اشیاء کی طرف چند قدم سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔ انسانی لاعلمی اور جہل کی تاریکی کے مقابل میں علم کی روشنی کا اتنا حصّہ بھی نہیں، جتنا گھنگھور گھٹا کے عالمِ ظلمات میں بجلی کی ایک آنی چمک کا ہوتا ہے

مذہب اِسی ظلمات میں اعتقاد و ایمان بالغیب کی مشعل سے رہنمائی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ عقل و حکمۃ (ریزن و سائنس) کی چمک تاریکی کے اِن بادلوں کو چھانٹ ہی نہیں سکتی۔ اُس کا چراغ ہدایت اس بحر ظلمات میں داخل ہوتے ہی گُل ہو جاتا ہے۔

مگر انسان کی فطرت میں کریدی، اُس کو بال کی کھال نکالے بغیر کل نہیں پڑتی ہے۔ اس لیے وہ صرف حوادث و ظواہر (ایپرنسز) کے جان لینے پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ فکر ہوئی کہ عالم بہ حیثیت مجموعی کیا ہے؟ اُس کی ابتدا کیسے ہوئی؟ انتہا کیا ہوگی؟ ذہن اور موجودات خارجی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ہم کیا ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں جانا ہے؟ غرض کائناتِ فطرت (نیچر) سے نکل کر فوق الفطرۃ اسرار پر سے پردہ اُٹھانے کی خلش پیدا ہوئی، جو عقل انسانی کے لیے شجر ممنوع تھا۔

اِن سوالات کے پیدا ہوتے ہی آدمی سائنس کی چار دیواری سے نکل کر فلسفہ یا صحیح معنی میں مَا بعد الطبعیات (میٹافزکس) کی نامحدود فضا میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں پہنچکر علوم طبیعیہ (فزیکل سائنس) کے یقینیات و قطعیات کا سر رشتہ ہات سے چھوٹ جاتا ہے۔ یہ ظن و قیاس کا عالم ہے، جہاں کسی بات کی قطعیت و یقینیت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

ہر کس ز سر قیاس چیزے گفتند
معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نشد

مذہب یعنی الٰہیاتی (میٹا فزکل) مسائل سے ٹکراتا ہی، اور جنگ و صلح کا جو کچھ امکان ہی وہ "مذہب و فلسفہ" میں ہی، نہ کہ "مذہب و سائنس" میں۔ اِس لیے اصل بحث "فلسفہ و مذہب" کے باہمی تعلقات کی توضیح و تصحیح ہی جس کے سمجھنے کے لیئے تین باتوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

(۱) فلسفہ اور مذہب کی منزلِ مقصود بے شک ایک کہی جا سکتی ہی، لیکن دونوں کی راہیں اس قدر مختلف اور الگ ہیں کہ اگر غلط فہمیوں اور خلطِ مبحث کو صاف کر دیا جائے، تو تصادم کا کوئی احتمال و اندیشہ نہیں رہ جاتا۔ مذہب کی بنیاد تمام تر ایمان و اعتقاد پر ہی، اور فلسفہ کی تعمیر قیاس و استدلال سے ہوتی ہی۔ مذہب کے اندر جہاں عقل آرائیوں کو راہ دی گئی، وہ اپنی قوت و حقیقت گم کر کے فلسفہ بن جاتا ہی۔ (تفصیل آگے آویگی)۔

(۲) بحث کا اہم نکتہ یہ ہی کہ اگر تصادم ہو بھی، تاہم یہ کہنا یا سمجھنا سخت جہل ہوگا، کہ فلسفیانہ قیاسات و دلائل مذہب کو آخری اور قطعی طور پر باطل یا ثابت کر سکتے ہیں۔ فلسفہ و الٰہیات خود اتنے متناقض آرا و خیالات کے مجموعہ کا نام ہی کہ نہ تو وہ معیارِ حق بن سکتا ہی، نہ اُس کی بنا پر عقل و مذہب میں سے کسی کی فتح و ہزیمت کا اعلان کیا جا سکتا ہی۔ اس کی غرض انسان کی صرف اُسی فطری کرید اور موشگافیوں کی تسکین ہی، جو اُس کی عقل کو باوجود اعترافِ نارسائی، مابعد الطبیعات کی ارضِ ممنوعہ میں قدم رکھنے پر مضطر و بے اختیار کر دیتی ہی۔

(۳) سب سے آخری بحث یہ ہی کہ فلسفہ کی ڈھائی ہزار سال کی تاریخ ہمارے سامنے موجود ہی۔ دیکھنا یہ ہی کہ واقعیت کے لحاظ سے اس طویل مدت میں فلسفہ کس حد تک مذہب کا حریف و عنید رہا ہی؟ اس کا صحیح جواب بیکن نے دیا ہی، جس کی تصدیق و شہادت میں قدیم و جدید فلسفہ کے مجلدات ہم آہنگ ہیں کہ "فلسفہ کا قلیل و سطحی علم الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہی، لیکن اُس کا گہرا علم مذہب سے قریب کر دیتا ہی"۔

تاریخِ فلسفہ کا دفتر یوں تو بے پایاں ہی۔ لیکن اس کا نچوڑ چار مذاہب (اسکول) ہیں (۱) ثنویت یا دوئی (۲) تصوریت یا روحیت (۳) مادیت اور (۴) ارتیابیت۔ اِن میں کہ دونو

اوّل الذکر تو براہِ راست یا بالواسطہ مذہب کے مؤید و حامی ہیں۔ تیسرا معاندہے، اور چوتھا نہ دوست نہ دشمن۔

ثنویت کا ماحصل یہ ہے کہ کائنات میں دو بالکل مختلف و متضاد چیزیں موجود ہیں، جسم و روح ایک قطعاً بے حس و حرکت مادہ کا ڈھیر ہے، دوسری مجرد اور عقل و شعور کا مصدر ہے۔ عہد قدیم کے سب سے بڑے فلسفی و حکیم ارسطو کا مسلک یہی تھا۔ دورِ جدید کے آغاز تک دنیا کے فلسفہ کا بیشتر حصہ اُسی کا پیرو رہا ہے۔ فلسفۂ جدیدہ کا ابوالآبا، ڈیکارٹ بھی ارسطو ہی کا ہم نوا ہے۔ تمام مذاہب کی ظاہری تعلیمات کا بھی یہی خلاصہ ہے بلکہ سچ پوچھو تو روح ہی کا عقیدہ مذہب کی جڑ ہے۔ باقی جزاء و سزا، حشر و نشر وغیرہ اسی کی تفریعات ہیں۔

دوئی کے ماننے والوں کے خلاف ایک طرف تصوریہ (آئڈیلیٹس) کا یہ دعویٰ ہے کہ اصل الاصول ایک ہی شئے ہے، اور وہ روح، عقل یا ذہن ہے باقی تمام عالم جسمانیات اسی کا تصور، پرتو، یا اور کسی نہ کسی طرح سے اسی سے پیدا و مستنبط ہے۔ مادیات کا مستقل وجود محض ایک قسم کا فریب (الیوژن) ہے اس مسلک کا پرانا رہبر افلاطون مانا جاتا ہے جس کی جگہ خالص فلسفہ کی بزم میں ارسطو سے بھی بلند تر ہے۔ اور عہد حاضر کے تو کہنا چاہیے کہ تمام اساطین فلسفہ اسی ایک علم کے نیچے جمع ہو گئے ہیں۔ اسپنوزا، لبنز، برکلے، فختے، شیلنگ، ہیگل، برگسن سب کے سُر اسی ایک تان پر آ کے ٹوٹتے ہیں۔ مذہب میں صوفیہ اور ارباب باطن سے اِن قائلین تصوریت کے ڈانڈے اِس قدر مل جاتے ہیں کہ صرف حال اور قال کا پردہ رہ جاتا ہے۔

دوسری طرف طبل مادیت کی یہ صدا ہے کہ بے شک اصل الاصول ایک ہی شئے ہے لیکن یہ روح نہیں ہے بلکہ مادّہ ہے۔ عقل و شعور وغیرہ جن کو تم افعال روح خیال کرتے ہو، یہ ذرات مادی ہی کے اجتماع، ترکیب اور تعامل کے نتائج ہیں۔ یہ مادّہ اور اس کی قوت یا انرجی دونو ازلی اور غیر مخلوق ہیں۔ اور اس لحاظ سے دونو ایک ہی ہیں کہ ایک کا دوسرے

سے انفکاک یا جدا ہونا ناممکن ہی۔

مادہ یا قوت ہی کے بندھے ہوئے مقررہ طریق عمل اور اصول عمل کا نام فطرت (نیچر) اور قوانینِ فطرت (لاز آف نیچر) ہی۔ ساری کائنات ارضی و سماوی، اسی فطرۃ اور مادہ سے پیدا ہی۔ کسی خارج مستقل الوجود، صاحب الامر خالق یا خدا کی احتیاج نہیں ہی۔[1] "فطرت خود بخود خداؤں کی مداخلت کے بغیر سب کچھ کرلیتی ہی۔"[2] "مادہ خالی ہیولیٰ یا محض منفعل ذات نہیں ہی، جیسا کہ فلاسفہ اس کی تصویر کھینچتے ہیں۔ بلکہ وہ مادر کائنات ہی جو خود اپنے ہی رحم سے تمام نتائج برآمد کرتی ہی۔"[3]

پس فلسفہ کے مذاہب اربعہ میں یہی ایک مذہب ہی، جو الحاد اور بے دینی کے نتائج پیدا کرسکتا ہی۔ یہ اسکول اگرچہ اُتنا ہی قدیم ہی، جتنا کہ خود "فلسفہ" اور آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے دیمقراطیس کے ہاتھ مستقل نظام (سسٹم) کی صورت اختیار کرچکا تھا، لیکن قدیم زمانہ میں اس کی تعلیمات کو کچھ زیادہ رواج اور قبولیت نہ حاصل ہوسکی۔ دیمقراطیس کے مشاہیر اتباع میں، اپیکورس، لیوکریٹس وغیرہ کے دو چار ناموں سے زیادہ نہیں ملتے۔

قرون وسطیٰ میں مذہبیت کے نقار خانہ کی صدا اس قدر فلسفہ کی فضا میں گونجی ہوئی تھی کہ کوئی اور آواز سنائی نہیں پڑتی تھی اور "مادیت" کی ہستی تو بس طاقِ نسیاں کے نقش ونگار سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ سولھویں صدی کے آخر میں برونو نے اِن فراموش نقش ونگار کو یاد کیا، تو اس جرم میں مجلسِ احتساب کی آتش غیظ وغضب نے اِس کو آگ میں جھکوا دیا۔

اِس عاشق علم کے ستی ہوجانے کے بعد سترھویں صدی میں جہاں سے اور چیزوں کے ساتھ، فلسفہ کا بھی "عصر جدید" شروع ہوتا ہی، گسنڈی نامی ایک شخص نے دیمقراطیس کو پھر زندہ کیا۔ اور سچ یہ ہی کہ دنیائے سائنس میں اب وہ زندہ جاوید بن گیا ہی۔ اور اس پر

[1]، [2]، [3] علی الترتیب لیوکریٹس اور برونو کے مقولے ہیں۔

نظریہ سالمات مسلّمات حکمت میں داخل ہوگیا ہے۔

لیکن اس نظریہ، مادیت کو الحاد و انکار مذہب کا سرچشمہ بنانے میں سب سے زیادہ حصّہ جس چیز کا ہے، وہ پچھلی دو صدیوں میں سائنس کے عظیم الشان انکشافات و تحقیقات کے نتایج ہیں ان میں سے چار ہماری موجودہ بحث کے لیئے زیادہ اہم ہیں (۱) استمرار مادہ و قوت۔ (۲) نظریہ اصل الانواع یا ارتقا (۳) کیمیادی مواد حیات کا علم (۴) افعال ذہنی و جسمی کا تعلق۔

یہاں ان مسائل سائنس کی تائید یا تضعیف مقصود نہیں، نہ ان کی واقعیت وقطعیت میں شک اندازی، بلکہ محض اُن مغالطہ آمیز نتائج پر سے پردہ اُٹھا دینا ہے، جن پر عوام کیا خواص تک کی نظر نہیں پڑتی، اور جو محض غلط فہمی اور خلط مبحث کی بدولت مذہب کے خلاف سمجھے جاتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے آخرالذکر کو لو، یعنی افعال ذہن وجسم کا تعلق۔ ثنویہ کی طرح اہل مذہب کا بھی یہ اعتقاد ہے کہ روح جسم سے ایک بالکل مختلف بلکہ متضاد حقیقت رکھتی ہے اور جسم اُس کے لیئے محض ایک آلہ عمل ہے۔ افعال ذہنی اسی روح کے افعال ہیں۔ اِس باب میں سائنس کی تحقیقات، یا علم "افعال الاعضا" (فزیالوجی) کے انکشافات کا ماحصل یہ ہے، کہ ہر ذہنی یا روحی فعل کے مقابل میں کوئی نہ کوئی جسمی تغیر بھی پایا جاتا ہے۔ اگر افعال ذہن میں کچھ خلل واقع ہوتا ہے تو ساتھ ہی دماغ یا اعصاب میں بھی کوئی نہ کوئی فتور ملتا ہے۔ یہاں تک کہ مختلف افعالِ ذہن شعور، حافظہ، ادراک وغیرہ کے لیئے، دماغ میں الگ الگ خانے یا حصّے ہیں، اور ایک ہوشیار عالم عضویات ان حصّوں میں سے جس کو چاہے علٰحدہ کرکے ذہن کے اس فعل کو باطل کرسکتا ہے۔ مثلاً اگر حافظہ کا حصّہ دماغی کاسہ سر سے کسی طرح نکال لیا جائے، تو پھر اُس آدمی کو کوئی بات یاد نہ رہے گی۔ کتوں وغیرہ پر اس قسم کے تجربات کئے بھی گئے ہیں۔ غرض تجربہ و استقرا سے یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا ہے کہ افعال ذہن و تغیرات جسمیہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

اِس نتیجۂ استقرائی کے تسلیم میں عذر نہیں۔ لیکن اس سے آگے بڑھکر اہل مادیت کا یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ افعال ذہن اِن تغیرات جسمیہ کے ہی پیدا کیے ہوئے یا معلول ہیں، نہ استقرا پر مبنی ہے، اور نہ یہ فزیالوجی کی کوئی سائنٹفک تحقیقات ہے۔ ماہر عضویات اتنا اور صرف اتنا جانتا ہے کہ جب شعور و ادراک کا فعل واقع ہوتا ہے، تو ساتھ ہی ساتھ کاسۂ سر کے اندر جو بھورے رنگ کا مادہ بند ہے، اُس میں بھی ایک خاص تغیر واقع ہوتا ہے۔ اب اس کی تعلیل کے لیے جس طرح یہ صورت ممکن ہے، کہ شعور و ادراک اس بھورے مادہ کا آفریدہ و معلول ہو، اِس سے کسی طرح کم درجہ کا امکان یہ نہیں ہے کہ شعور و ادراک کسی اور غیر مادّی ہستی کا فعل ہو جو اعضائے دماغ و نظام عصبی کو بطور ایک آلہ کے استعمال کرتی ہو۔

یہ بحث مابعد الطبیعیات کی دنیا کے ظنیات و قیاسات کی ہے، سائنس اس کو ہاتھ لگا سکتی ہے، نہ کسی سائنٹفک واقعہ کی طرح تجربہ و مشاہدہ سے اس کا کوئی قطعی و یقینی فیصلہ کر سکتی ہے، اس بنا پر اب محققین و کبار علمائے سائنس کا صرف اتنا ہی دعویٰ ہے کہ افعال ذہن و تغیرات جسم ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے متوازی[1] واقع ہوتے ہیں، اور بس۔ باقی اِن کے باہمی تعلق کا (کہ کون علت ہے اور کون معلول) نہ علم ہے اور نہ اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ ہے۔ پروفیسر ٹنڈل جو اپنے خطبہ بلفاسٹ کی بدولت ملحد و مادہ پرست سب کچھ کہا جاتا ہے، اور جس کا شمار رجال سائنس میں ہے، اُس کا اعتراف سنو:-

"اگر ہمارے ذہن و حواس کی وسعت، قوت اور روشنی اس درجہ بڑھ جاتی اور تیز ہو جاتی کہ ہم دماغ کے خود مکسرات (مالی کیولز - جسم کے غیر مرئی ذرات) کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور محسوس کر لیتے، ان کے تمام حرکات مختلف اجتماعات اور برقی اعمال ( ) کو اگر ایسا ہوتا، ایک ایک کرکے جان لیتے اور ان کے مقابل کی کیفیات فکر و ادراک سے پوری طرح آگاہ ہوتے، جب بھی اس معمہ کے حل کرنے سے ہم اُتنے ہی دُور پڑے رہتے، جتنا کہ ہمیشہ رہے ہیں کہ "یہ جسمی تغیرات واقعات شعور سے

[1] اسی بنا پر اس نظریہ کا نام متوازیت (پیرلیلزم) ہے۔

کیونکر وابستہ ہیں یا اُن میں کیا تعلق ہے"؟ ان دو قسم کے واقعات کے درمیان، جو خندق حائل ہے، وہ اب بھی عقل کے لئے ناقابل عبور رہی رہتی۔ فرض کرو کہ شعورِ محبت کا تعلق داہنی جانب کے تکسرات دماغ کی ایک پیچیدار حرکت سے ہے اور شعور نفرت بائیں جانب کی اسی قسم کی ایک پیچیدہ حرکت سے وابستہ ہے۔ لہذا اس سے ہم کو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ جب ہمارے اندر محبت کا شعور پیدا ہوتا ہے تو حرکت کا رُخ ایک طرف ہوتا ہے اور شعور نفرت کے وقت دوسری طرف لیکن "کیوں"؟ اس کا جواب ہمیشہ اسی طرح ناممکن رہیگا جیسا کہ پہلے رہا ہے۔"........

..."میں نہیں سمجھتا، کہ کوئی مادی یہ کہنے کا حق رکھتا ہے، کہ اِس کے اِن تکسرات کی حرکات و اجتماعات (گروپس) سے ہر شئے کی توجیہ و تشریح ہوجاتی ہے حقیقت یہ ہے، کہ اُن سے کسی شئے کی بھی توجیہ نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ جو کچھ دعویٰ کرسکتا ہے، وہ صرف اِن دو قسم کے واقعات کی باہمی وابستگی کا ہے، جن کے حقیقی رشتہ اتحاد و وابستگی سے وہ مطلق جاہل ہے۔ جسم و روح کے تعلق کا مسئلہ آج بھی اپنی موجودہ صورت میں اُسی طرح ناقابل حل ہے، جس طرح عصر حکمۃ و سائنس سے پہلے تھا"، ہم نظام عصبی کے ارتقا کا پتہ لگا سکتے ہیں، اور احساس و فکر کے متوازی واقعات کو اِس سے وابستہ بتا سکتے ہیں۔ تاہم غیر مشتبہ یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی باہمی وابستگی کی حقیقت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو وہ محض ہَوا ناپنے کی کوشش ہوتی ہے"۔[2]

(۲) روح ہی کی طرح "حقیقتِ حیاۃ" کا راز بھی سربستہ ہے۔ کوئی نہیں بتا سکتا، کہ زندگی کیا ہے؟ کہاں سے آئی؟ کیونکر پیدا ہوئی یا ہوتی ہے؟ یہاں بھی سائنس کا قدم اپنی رسائی کی حد تک جا کر رُک جاتا ہے۔ اور تجربہ و استقرا سے صرف اتنا دریافت ہوسکا ہے، کہ حیاۃ کی سب سے ابتدائی اور انتہا سے انتہا بسیط شکل کیا ہے۔ اس کا نام علم الحیاۃ کی اصطلاح میں پروٹوپلازم ہے

---

[1] "خطبات و مقالات" از ٹنڈل صفحہ ۹۵ آر۔ پی سیریس۔

[2] خطبہ بلفاسٹ صفحہ ۴۰۔

جو بہ قول ہکسلے کے مادی یا "جسمی اساس حیاۃ" اور تمام معلوم اصناف زندگی کی بنیادی معمورہ حیات اسی پروٹو پلازم کے چھوٹے بڑے مختلف الانواع اجتماعات و مرکبات کی آبادی ہی۔

کیمسٹری نے ایک گرہ اور کھولی ہی اور یہ پتہ لگایا ہی کہ یہ بسیط اساس حیاۃ کاربن، ہائڈروجن، آکسیجن اور نائٹروجن کے بسائط عناصر سے بنا ہوتا ہی۔ ان کیمیاوی اجزایا "مواد حیاۃ" کے معلوم ہو چکنے کے بعد سے اہل سائنس کے حلقوں میں یہ امید بھی باندھی جانے لگی ہی کہ کیا عجب ہی، کہ وہ دن بھی آکر رہے جب کہ لبورٹری میں ان عناصر کی ترکیب سے ہم زندگی اسی طرح پیدا کر لیا کرینگے، جس طرح آج آکسیجن اور ہائڈروجن ملا کر پانی بنا لیتے ہیں۔ اس دن گویا راز زندگی کھل جائیگا۔

بلاشبہہ ایسا ہونا کچھ ناممکن نہیں ہی۔ اور اس حد تک راز زندگی کھل بھی سکتا ہی، کہ سائنس کے ہفتخواں کی یہ آخری منزل ہوگی۔ لیکن کیا اس سے حقیقت حیاۃ کا آخری عقدہ بھی کھل جائیگا، کہ زندگی بالذات کیا شئے ہی؟ ان بے جان عناصر کے خالی اجتماع سے جان کہاں سے اور کیونکر آجاتی ہی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جواب سے سائنس کی زبان اسی طرح عاجز ہی جس طرح یہ بتلانے سے بے بس تھی کہ "داہنی جانب کے مکسرات دماغ کی حرکت سے شعور محبت اور بائیں جانب کے مکسرات کی حرکت سے شعور نفرت کیونکر اور کیسے پیدا ہو جاتا ہی"؟

(۳) مذہب کی عمارت کا بڑا حصہ روح اور حیاۃ کی پراسرار بنیادوں پر قائم ہے اس لئے اگر سائنس نے ان اسرار کے افشا کا ادعا کیا اور اہل مذہب اس پر کھٹکے تو کچھ زیادہ بیجا نہ تھا۔ لیکن سخت حیرت کی بات یہ ہی، کہ تحقیقات اصل الانواع (اوریجن آف اسپشیز) یا ارتقا کے انکشاف سے کیوں ارباب مذہب اتنا بھڑک اٹھے۔ بات وہی ہی کہ مرعوب اور دہشت زدہ آدمی کو سایہ پر بھی دیو کا گمان ہوتا ہی۔

ورنہ اگر قانون ارتقا کو ایک ناقابل انکار حقیقت بھی مان لیا جائے، اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ جسم کے ساتھ حیاۃ و روح میں بھی ارتقا ہی، تو بھی اِن کی مابعد الطبعیاتی (میٹافزیکل) حقیقت کا راز اُسی طرح سربمہر رہ جاتا ہی، جیسا کہ اِس انکشاف سے صدیوں پہلے تھا۔ نظریہ ارتقا اِس سے زیادہ کچھ بھی دعویٰ نہیں کرسکتا نہ کرتا ہی کہ انسان کے جسم کی موجودہ ساخت اور اُس کے نفس و روح کے افعال کا موجودہ درجہ ذی حیات اجسام و نفوس کے ابتدائی مدارج سے آہستہ آہستہ ترقی کر کے اس حد تک پہونچا ہی۔

لیکن یہ بعینہ وہی شے ہی جس کو ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، اور ذرا بھی متعجب نہیں ہوتے۔ بچے کے روح یا ذہنی افعال ولادت کے دن سے لے کر "ڈاروِن" ہونے کے دن تک جس طرح تدریج نشو و نما پاتے ہیں اور تعلیم، صحبت، و تندرستی وغیرہ کے خارجی حالات عقل و ذہن کی ترقی و تربیت پر جو اثر رکھتے ہیں، اُس کو ن نہیں جانتا۔ پھر بچہ، "ماء دافق" کے چند قطرات سے انسان کامل کی صورت تک پہنچنے میں نو مہینوں کے اندر کتنے چولے تبدیل کرتا ہی، سانپ اور بندر خدا جانے کن کن مخلوقات کے عالم جنین سے گزرتا ہی جب جا کر کہیں اس قابل ہوتا ہی کہ "اشرف المخلوقات" کا بچہ کہلائے۔ فرق صرف مدت کا ہی۔ "ماء دافق" کے جراثیم کو انسان بننے میں نو ہی مہینے لگتے ہیں۔ لیکن ادنیٰ درجہ کے حیوانات کو انسانی "احسن تقویم" تک پہنچنے میں اَن گنت صدیاں لگ گئیں۔ بچہ کی بے عقلی پچاس ہی سال میں بڑھ کر "اصل الانواع" کے مصنف و مکتشف کی عقل کے برابر ہو جاتی ہی، مگر نفس حیوانی کو روح انسانی تک کی مسافت طے کرنے میں ہزاروں برس صرف ہو گئے۔

اِس لیے اگر قانون ارتقا کے علم سے مذہب کی زمین پر زلزلہ کا کوئی صدمہ محسوس ہوا تو ڈاروِن اور اسپنسر[1] کے وجود سے پہلے ہی مذہب کی عمارت کو زمین دوز ہو جانا

---

[1] (۱۸۲۰ء یا ۱۹۰۳ء) اسپنسر نے قانون ارتقا کو اس قدر وسعت دی کہ ذہنی، تمدنی، اخلاقی، اجتماعی تمام چیزیں اس کی تحت میں آ گئی ہیں۔

تھا۔ لیکن اگر مذہب کی تعمیر اسرار روح وجسم کے اُس اساس پر ہی، جس کی گہرائی تک سائنس کا واہمہ بھی نہیں جاسکتا ہی، تو مذہب کے دامن تک سائنس کا گستاخ ہاتھ نہ آج تک دراز ہوسکا ہی، نہ آیندہ ہوسکتا ہی۔ ع

این زمین را آسمانے دیگرست

(۴) روح، حیات اور اصل الانواع سے متعلق سائنس کے اِن اکتشافات کو، زیادہ سے زیادہ، مویدات مادیت کہا جاسکتا ہی۔ لیکن اصل جڑ جس کے یہ سب برگ وبار ہیں، استمرار مادّہ وقوۃ کا ادعا ہی جس کا ماحصل یہ ہی کہ مادہ اور اُس کی قوت دونوں ازلی اور ابدی ہیں۔ اُن کو نہ کسی نے پیدا کیا، نہ کوئی فنا کرسکتا ہی ان کا وجود ایک دوسرے کے ساتھ غیر منفک طور پر وابستہ ہی۔ عالم کی تمام نیرنگیاں، زمین وآسمان کی ساری عجائب کاریاں اور جسم وروح کے سراپا مظاہر، یکسر وکلیۃً بلا استثنا ان ہی دو کے خلق وامر کا تماشہ گاہ ہیں۔

اولاً تو "استمرار مادہ" کا نظریہ، محض ایک نظریہ اور مابعد الطبیعاتی نظریہ ہی، یہ قول ایک حال کے عالم سائنس کا (الگزنڈر اسمتھ) کہ اس کا تعلق ایسے "مفروض واقعات سے ہی جو گویا یکسر ہمارے تجربہ کی حد سے باہر ہیں۔ اس لیے یہ ایک فوق الفطرہ نوعیت کا مسئلہ ہی جس کی اصلی جگہ مابعد الطبیعات میں ہی"، یہ کوئی ایسی سائنٹفک حقیقت نہیں ہی، جس کی نفی نہ کی جاسکتی ہو۔ بلکہ ہمارے زمانہ کا مشہور ومسلم سائنٹسٹ سر آلیور لاج تو علی رؤس الاشہاد کہتا ہی کہ "مادہ کا فنا وتکوین اچھی طرح تخیل سائنس کے اندر داخل ہی اور امکان تجربہ کی حد میں آسکتا ہی"۔

لیکن ہمارے مقصد کے لیئے اس باب میں اہم المباحث، نفس مادہ کی حقیقت ومہیت کا مسئلہ ہی، مادہ کیا ہی؟ اِس کی نسبت انسان کیا جانتا ہی یا جان سکتا ہی؟ تو ہمیں اُس کا کیا تعلق ہی؟

اختبار و تجربہ کی مدد سے حقیقت مادہ کے متعلق، سائنس جن قیاسی نتائج تک پہنچ سکی ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی قسم کے بھی مرکب خواہ مفرد اجسام اگر تم تحلیل و تقسیم کرتے چلے جاؤ تو بالآخر وہ ایسے چھوٹے سے چھوٹے اجزا یا ذرّات پر جاکر ٹھہر جائینگے، جن کی اب آگے تقسیم و تجزی نہیں ہوسکتی۔ اِن ہی کا نام سالمات (ایٹم) ہے۔ ہر دو سالموں کے بیچ میں کچھ نہ کچھ فصل یا دُوری ہوتی ہے جو ایک اور لطیف تر ناقابل وزن مادہ سے پُر رہتی ہے۔ اس کا نام ایتھر ہے۔ یوں سمجھو کہ کائنات کی ساری فضا ایتھر کا ایک سمندر ہے، جس میں سالمات تیرتے پھرتے ہیں۔ زیادہ حال کی تحقیقات یہ ہے کہ ان سالمات کی تعمیر ایک اور قسم کے ناقابل تصور چھوٹے چھوٹے ذرات سے ہی جو بجلی کے ہیں۔ ان کو الکٹرنس (ذرات کہربائی یا برق پارہ) کہا جاتا ہے۔ اِن قیاسات کو صحیح مان کر، جو حقیقت میں صرف ساخت مادہ پر روشنی ڈالتے ہیں، ماہیت مادہ سے کوئی سروکار نہیں رکھتے، اب سوال یہ ہے کہ خود سالمات یا الکٹرنس کیا ہیں؟

اِس کے جواب میں سائنس والے پہیلیاں بجھاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ جسم کے یہ آخری و انتہائی اجزائے ترکیبی مراکز قوت (سنٹرلائزڈ فورس) ہیں۔ کسی کا ادعا ہے کہ نہیں ان کی اصل مابعد الطبعیاتی نقطوں (میٹافزیکل پوائنٹس) سے زیادہ نہیں ہے، جو سکون سے حرکت میں آکر قابل حس مادہ کی صورت اختیار کرتے ہیں، اور کوئی سالمہ کی جگہ نقطہ اقلیدسی یا ہندسی نقطہ کا قائل ہے جو مید قوت ہے (خواص مادہ از پی جی ٹیس)۔ الکٹرنس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بحر ایتھر کے گرداب، اُس کے تموجات کی گرہیں یا اُس کی سطح کی شکنیں ہیں۔ غرض ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بات یہ ہے کہ جس طرح نفس مادیت ایک خالص فلسفیانہ مسلک ہے جس پر بحث دائرۂ سائنس سے خارج ہے۔ اسی طرح عقلیات میں ماہیت مادہ کی نسبت موشگافیوں کا حق

بھی تنہا مابعد الطبیعیات ہی کو حاصل ہے، اور سائنس کا وظیفہ ماہیت اشیا کی تحقیق نہیں ہے۔ لہٰذا اِس بحث کے تصفیہ کے لیئے سائنس کے بجائے فلسفہ کی عدالت کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔

فلسفہ قدیمہ کے دور اوّل میں دیمقراطیس نے جب پہلے پہل مادیت کی صدا بلند کی، تو اُس وقت تک کسی کو کہنا چاہیئے کہ یہ وہم تک نہ تھا کہ خود مادہ کی حقیقت بحث طلب ہے یا اُس کے اصل وجود سے انکار ممکن ہے۔ چند دن بعد فلاطوں نے اس کی جرات کی، مگر اِس بغاوت کا علم خود اُس کے شاگرد ارسطو ہی نے بلند کر دیا۔ اور آنے والی نسلوں پر وہ اپنے استیلا و تسلّط سے اس قدر چھا گیا کہ صدیوں تک دُنیائے فلسفہ کا وہ خدائے غیر مسئول بن کر جبار رہا۔ اِس لیئے اگر عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں پیروان دیمقراطیس کی زبانوں سے یہ کلمات نکل گئے تو کوئی محل استعجاب نہیں کہ "مادہ ساری کائنات کا رحم مادر ہے، تمام چیزیں صرف اسی کے نتائج ہیں"۔ لیکن اُنیسویں صدی میں کسی ذمہ دار عالم فلسفہ و سائنس کا یہ کہہ گزرنا کہ "مادہ اور قوانین مادہ نے وجود روح اور عقیدۂ تکوین کو باطل کر دیا" موجب صد حیرت ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں مادیت کی بنیاد کمزور تھی، جدید تحقیقات و انکشافات نے اِس کو مستحکم بلکہ اٹل بنا دیا ہے۔ لیکن واقعہ بالکل برعکس ہے۔ جدید تحقیقات و انکشافات ہی نے مادیت کا قدم ہمیشہ کے لیئے اکھاڑ دیا ہے۔

مادیت میں گھن تو آج سے دو سو برس پہلے ہی لگ چکا تھا، جب لاک نے صفات اوّلیہ اور ثانویہ کی تقسیم کر کے یہ ثابت کر دکھایا تھا، کہ رنگ، مزہ، بو وغیرہ صفاتِ ثانویہ محض ذہن کے احساسات ہیں اور خارج میں ان کا یا ان کے مماثل کسی شئے کا کوئی وجود نہیں۔ برکلے نے صفاتِ اوّلیہ شکل (فیگر) و امتداد (اکسٹنشن) وغیرہ کو بھی اِسی حکم میں داخل کر دیا اور اِس طرح چھت سے لے کر نیو تک ساری عمارت ہی ڈھا دی۔

آدمی براہِ راست جو کچھ جانتا ہے، وہ اپنے ہی احساسات ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ کسی احساس کا وجود احساسات کرنے والے ذہن یا نفس سے باہر نہیں موجود ہوتا۔ تمھارے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے، جس سے درد محسوس ہوتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ درد کی یہ خاص کیفیت یا اس کے مماثل کوئی چیز تم سے باہر کانٹے وغیرہ میں کہیں پائی جاتی ہے۔ کنین زبان پر رکھتے ہی جس تلخی کے احساس سے تم مُنہ بنا لیتے ہو، کیا یہ احساس یا کیفیت خود کنین میں پائی جاتی ہے؟ اگر ایسا ہے، تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ انسان کی طرح کنین میں بھی حاسۂ ذوق موجود ہے۔ غرض اسی طرح سامعہ و باصرہ، لامسہ و شامّہ وغیرہ کے تمام محسوسات رنگ مزہ، بو، آواز، سردی گرمی، شکل و امتداد، سب کی سب صرف احساس کرنے والی ذات کے اندر پائے جاتے ہیں، باہر کوئی وجود نہیں ہوتا، مثال کے لیئے ایک آم لو۔ اس میں سے رنگ و بو، شکل و صورت، وزن و ذائقہ وغیرہ کے تمام احساسات نکال ڈالو، اور پھر بتاؤ کہ تمھارے پاس کیا رہ جاتا ہے، جس کے براہِ راست معلوم ہونے کا تم دعویٰ کر سکتے ہو؟ کچھ نہیں۔ ان احساسات ذہنیہ کو مادہ کہا نہیں جا سکتا۔ اِن کے ماوراء کسی چیز کا علم نہیں[1] ؂

پُر دہی گر پڑا کبوتر کا
جس میں نامہ بندھا تھا دلبر کا

اِس بنا پر برکلے نے کسی موجود فی الخارج، قایم بالذات شئے یا مادہ کا سرے سے انکار ہی کر دیا۔ ہیوم بھی دبی زبان سے برکلے ہی کا ہم آواز ہے۔ کینٹ[2] نے البتہ ذرا ہٹکر یہ کہا کہ ہاں اِس میں تو شک ہی نہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں، وہ اپنے ہی احساسات ہوتے ہیں، اِن کے ماوراء ذات اشیا کا علم نہ ہوتا ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ ان احساسات کے مماثل کوئی چیز ذہن سے باہر موجود ہوتی ہے۔ لیکن ایک ایسی نامعلوم شئے کوئی ہے

---

[1] مزید تفصیلات و رفع شکوک کے لیئے "برکلے" (مطبوعہ شبلی اکاڈمی اعظم گڈھ) دیکھو۔

[2] ۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء۔

Unknown) جو ان احساسات نفسی کی علت ہے۔ وہ خارج از ذہن پائی جاتی ہے، اور وہی مادہ ہے۔

کینٹ کی اس انجانی کوئی چیز (Something Unknown) کا فرض چونکہ کسی مضبوط استدلال پر مبنی نہ تھا اس لیے فلسفہ اور مابعد الطبعیات کی دنیا میں، تو اس کو بہت زیادہ فروغ نہ نصیب ہو سکا۔ خود کینٹ کی زندگی، اور اس کے وطن ہی (جرمنی) میں بعد کو جو نامور فلاسفہ و متالہین (میٹا فزیشینز) گزرے، یعنی فختے، شیلنگ، ہیگل وغیرہ وہ سب کی سب آئیڈلیسٹ (تصوریہ) یا منکرین مادہ تھے۔

لیکن اہل سائنس، جن کی کائنات ہی عالم جسمانیات ہے، وہ اس سررشتہ کو بالکل کیسے چھوڑ سکتے تھے اُن کو "انجانی کوئی چیز" کا کچا دھاگا ہی غنیمت معلوم ہوا، جس کو آخری سہارا سمجھ کر انھوں نے مضبوط پکڑ لیا۔ اور اب کینٹ کے بعد سے تقریباً تمام حکما کا یہی مذہب ہے کہ ذہن کے باہر کچھ نہ کچھ ہے تو ضرور، مگر ہم اس کے متعلق نام سے زیادہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ خود ہکسلے جو ایک جلیل القدر امام سائنس ہے اور جس کی زبان سے نکل گیا تھا کہ "مادہ اور قوانین مادہ نے روح و خلق کو باطل کر دیا" اس کا اعتراف سنو۔

"آخر کار ہم اس ہیبت ناک "مادہ" کی نسبت اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں کہ وہ ہماری کیفیات شعور کی ایک انجانی اور فرضی علت کا نام ہے؟ .....
..... اسی طرح ہم اُس روح کی نسبت بھی جس کے بارہ میں تہدید ہے کہ مادہ نے اس کو فنا کر دیا ہے اس سے زیادہ کیا جانتے ہیں، کہ وہ بھی ہمارے احوال و کوائف شعور کی نامعلوم و فرضی علت کا ایک نام ہے؟ دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ مادہ اور روح دونوں حوادث طبعی (نیچرل فنامنا)

---

[1] "ماہیت مادہ" کی مفصل بحث کے لیے "معارف" دسمبر ۱۹ء دیکھنا چاہیے۔

کے خیالی محل و ہیولیٰ ( ) کے محض نام ہیں"[1]

اتنا ہی نہیں، بلکہ حقیقت مادہ کا طلسم ٹوٹ جانے کے بعد، اب سائنس کو انتساب مادیت سے عار آنے لگی ہے، اور "آج کل سائنس اس سے زیادہ کسی بات کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی، کہ اُس کی جانب مادیت کا انتساب ہو۔ اس لئے کہ یہ بھی بہرحال اُسی طرح کا ایک فلسفیانہ ادعا (ڈاگما) ہے، جس طرح کہ تصوریت۔ مادیت مدعی ہے آغاز کائنات سے چلنے کی، جو سائنس کے بس سے باہر ہے"[2] اور مذہب کی بنا "آغاز و انجام کائنات" ہی کے معمہ پر ہے۔ جب سائنس کے ناخن سے یہ گرہ نہیں کھل سکتی، تو اس کو مادیت کا حلیف اور مذہب کا حریف سمجھنے یا کہنے کی جو بساط ہے ظاہر ہے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غرض اٹھارھویں صدی کے اواخر سے، جب سے عقلِ سائنس کو اپنی پرواز کا سدرۃ المنتہیٰ معلوم ہو گیا، اس سے آگے نارسائی پوری طرح متحقق ہو گئی، اور جہل مرکب کا پردہ آنکھوں پر سے اُٹھ چکا ہے۔ اُسی وقت سے اہل سائنس کا فلسفیانہ مسلک، مادیت نہیں بلکہ وہ لاادریت ہے، جو "مابعد الطبعیات" کے مذاہب اربعہ کا آخری نمبر ہے جس کی نسبت ہم لکھ آئے ہیں کہ وہ نہ مذہب کی دوست ہے، نہ دشمن۔

لاادریت کا خلاصہ اعتراف لاعلمی ہے، یہ اسکول بھی اگرچہ فلسفہ کے دوسرے اسکولوں کی طرح زمانہ قدیم ہی میں پیدا ہو چکا تھا، اور تشکیک یا ارتیابیت (سیپٹزم) کے نام سے پکارا جاتا ہے، مگر پرانے زمانے میں اس کا مفہوم اس قدر مطلق و وسیع تھا کہ خود شک میں بھی شک کیا جاتا تھا۔ عصر جدید میں اس کو ہیوم نے زندہ کیا اور

[1] "خطبات و مضامین" ہکسلے صفحہ ۵۵۔ آر پی سیریز۔
[2] "نظرت و لاادریت" ( ) نیچرلزم اینڈ آگناسٹزم (جزا۔ صفحہ ۱۰۔

کینٹ نے تو اِس کی بنیاد کو اس قدر مستحکم بنا دیا، کہ فلسفہ کیا علمائے سائنس کو بھی سرتابی
کی مجال نہ رہی لیکن اب مفہوم کی وہ پُرانی وسعت اور اطلاق نہیں باقی ہے۔ بلکہ واقعات
وحوادث (فنامنا) ظواہر اشیا (اپیرنسز) اور مسائل
طبعیہ کو عالم شک ولا علمی سے نکال لیا گیا ہے۔ البتہ ذوات واعیان (نامنا)
حقایق اشیا (ریلٹیز) اور مابعد الطبعیاتی مسائل کے دروازوں کو انسانی عقل و
علم کے لیئے ہمیشہ کے واسطے مقفل سمجھ لیا گیا ہے۔

لاادریت (اگنا سٹزم) کے لقب کا موجد ہکسلے ہے، اِس لیئے خود
اِسی کی زبان سے سنو کہ روح، خدا وغیرہ الہیاتی مسائل کی نسبت ایک لاادری کی کیا
پوزیشن ہے۔ چارلس کنگ سلے کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ

"میں انسان (روح) کے غیر فانی ہونے کا نہ مدعی ہوں نہ منکر۔ میرے پاس
اِس کے یقین کے لیئے کوئی دلیل نہیں۔ لیکن ساتھ ہی دوسری طرف اس کے ابطال
کا بھی میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔"

ایک اور موقع پر "اُصول ونتایج" (میتھڈس اینڈ رزلٹس) لکھتا ہے، کہ

"وجود کی علت اولی کا مسئلہ میرے حقیر قوی کی دسترس سے باہر ہے۔ جتنی
لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا موقع مجکو ملا ہے اُن میں سب سے بدتر اُن
فلاسفہ کے دلائل ہوتے ہیں، جو خدا کی حقیقت کے بارے میں موشگافی
کرتے ہیں۔ مگر ان فلاسفہ کے مہملات ان سے بھی بڑھ جاتے ہیں، جو یہ ثابت
کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی خدا نہیں۔"

ایک اور جگہ کہتا ہے، کہ

"چاہے حوادث و واقعاتِ مادہ کو روح کی اصطلاحات میں بیان کرو اور
چاہے حوادث روح کو مادہ کی اصطلاحات سے تعبیر کرو، یہ بجائے خود کوئی

اہمیت نہیں رکھتا، ہاں اتنا ہے، کہ سائنس کے لیے مادیانہ اصطلاح تعبیر زیادہ موزوں اور قابل ترجیح ہے"

بعض غلط فہمیوں سے بچنے کے لئے لاادریت کی حقیقت و مدعا کی ذرا اور توضیح ضروری ہے۔ علمائے سائنس کے اس فلسفیانہ مسلک کا منشا صرف اس قدر ہے، کہ ہماری سائنٹفک، تحقیقات و عقلی استدلالات کا گزر واقعات و ظواہر اشیا سے آگے نہیں۔ یعنی جس قسم کے استقرائی تجربات، و عقلی دلائل و قیاسات سے ہم علوم طبعیہ کے مسائل کو قطعی طور پر ثابت کر سکتے ہیں اور طرح طرح کے انکشافات تک پہنچ سکتے ہیں ان کے وسیلہ سے حقائق اشیا، اور مابعد الطبعیات کے مسائل کو ثابت یا باطل نہیں کیا جا سکتا ہے، نہ ان رموز کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہ نکلتا ہے، اور نہ نکالنا چاہیئے کہ جو شے انسان کی عقل و فہم سے خارج ہے وہ اس کی زندگی سے بھی خارج ہے یا انسان فقط انھیں چیزوں کو مانتا اور قبول کرتا ہے، جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لئے کہ عقل و دانش کے مدعی انسان کی عملی زندگی کا اکثر بلکہ کل حصہ ایسی ہی نادانیوں کا پروگرام ہے جن میں سے کسی ایک کو بھی عقل و حکمت سے ثابت نہیں کر سکتا ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ ہر قدم عقل کی روشنی میں اُٹھاتا ہے، حالانکہ اس کا سارا سفر زندگی جذبات و مرغوبات کی تاریکی میں طے ہوتا ہے۔

اس کے سارے اعمال زندگی کا محور زندگی اور عیش و آرام کی زندگی ہے۔ اس کا ایک فعل بھی نیک نامی، شہرت و عزت کے جذبات اور نفس کی لذت طلبیوں سے خالی نہیں ہوتا لیکن کیا کوئی شخص دعوی کر سکتا ہے کہ ان جذبات کی حقیقت و صداقت کو عقل نظری اور سائنس سے ثابت کیا جا سکتا ہے، آدمی جینے کے لئے مرتا ہے، مگر کیا وہ اپنی زندگی کی ضرورت کو کسی سائنٹفک دلیل سے ثابت کر سکتا ہے۔ صبح سے شام تک وہ ہزار چیزوں کو برا بھلا کہتا ہے لیکن کیا ان میں سے وہ ایک کی برائی بھلائی کو بھی خالص عقلی نقطہ نظر سے متعین کر سکتا ہے علمائے اخلاق

آج تک خیر و شر کا حقیقی معیار نہ بتا سکے مگر انسان کی زندگی سے اگر یہ امتیاز نکال لیا جائے تو دفعتہً ساری مشین بے حرکت ہو کر رہ جائے۔ انسان کو خود مختار اور صاحب ارادہ کون ثابت کر سکتا ہے بلکہ نفسیات و افعال الاعضا سے اس کا مجبور محض اور قطعاً بے بس ہونا ثابت ہوتا ہے مگر بتاؤ کہ تم صبح سے شام تک کتنے سکنڈ اپنے کو بے اختیار و بے ارادہ سمجھتے ہو۔ کیا اگر انسان خود مختاری کے اِس غیر سائنٹفک اعتقاد کو ذہن سے نکال دے سکے، تو پھر بھی عمل کے ہاتھ پاؤں میں کچھ جنبش باقی رہ جائے گی؟ کیا اولاد کے موت پر والدین کے غم و ماتم کو کوئی شخص خلاف عقل کہہ کر روک سکتا ہے؟ جب تک ثواب آخرت یا صبر و تحمل کے خراج تحسین کا کوئی اور زبردست جذبہ موجود نہ ہو۔

غرض انسان استدلالات نہیں، اعتقادات اور عقل نہیں، جذبات کا بندہ ہے اور مذہب کی بنا اعتقادات و جذبات ہی پر ہے۔ اِس لیے جب تک امید و بیم، محبت و نفرت، یاس و بے بسی، انعام و انتقام، احترام و تعظیم، حیرت و استعجاب، اور جمال پرستی وغیرہ کے جذبات انسان کے خمیر میں داخل ہیں، اُس وقت تک مذہب بھی انسانی وجود کا جز ہے۔ صورتیں بدل سکتی ہیں۔ لیکن اُس کی جڑ کو کوئی قوت دل سے اُکھاڑ کر نہیں پھینک سکتی۔ بہ قول پروفیسر ٹنڈل کے کہ "میرا دعویٰ ہے کہ کوئی ملحدانہ استدلال انسان کے دل سے مذہب کو خارج نہیں کر سکتا۔ منطق ہم کو زندگی سے محروم نہیں کر سکتی اور مذہب اہلِ مذہب کی زندگی ہے۔ مذہب انسان کے ذاتی یا وجدانی تجربہ کی حیثیت رکھتا ہے، جہاں منطق کا گزر نہیں[۱]" "جذبہ مذہب کی جگہ انسان کے سویدا رقلب میں ہے، اور آغاز تاریخ کے قرنوں پہلے سے تمام مذاہب عالم کا خمیر ہے۔ تم نے جو اس مذہب سے بھاگ کر عقل کی بلند و خشک روشنی میں پناہ لی ہے، اور اس کی ہنسی اُڑاتے ہو تو یاد رہے کہ ایسا کرنے سے تم صرف اعراض اور ظاہری صورتوں کو ہدف بنا سکتے ہو، لیکن احساس مذہب کے اُس غیر متزلزل اساس کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔"

[۱] صفحہ ۴۸، "خطبات و مقالات" ٹنڈل، آر۔ پی سیریز۔

جس کی جگہ فطرتِ انسانی کی گہرائی میں ہے"

زمین اور پہاڑوں کو کھود کر طبقات الارض کے اسرار جانے جاسکتے ہیں، سمندروں کی سطح پر جہاز اور آبدوزی کشتیاں چلائی جاسکتی ہیں، لیکن کیا اس سے اُس عظمت و ہیبت کے احساس میں فرق آسکتا ہے، ہمالیہ کی ہزارہا فٹ بلند چوٹیوں کے نیچے کھڑے ہونے سے، اور جہاز کی چھت پر کھڑے ہو کر ناپیدا کنار سمندر پر نظر دوڑانے سے پیدا ہوتا ہے؟ کیا علم حیوانات و نباتات پڑھ لینے سے، جمالِ فطرت کی پرستش کا وہ ذوق فنا ہو جاتا ہے، جو عالم بہار میں نظر کو ایک ایک پھول پتی سے حاصل ہوتا ہے اور جو کوئل کی کوک اور بلبل کی نغمہ سرائی سے سامعہ نوازی کرتا ہے؟ شاعر و مصور پر تو یہی پُر کیف موسم رقص طاری کر دیتا ہے[۱] ایک فنِ طب کا ماہر اپنے زمانے کا سب سے مشہور معالج، جس کے ہاتھ سے ہزاروں مریض شفا پا چکے ہیں، وہ ایک معمولی مرض سے اپنی اکلوتی، ہونہار جوان اولاد کو نہیں بچا سکتا، اور اپنی آنکھوں سے اس کے دم توڑنے کا تماشہ دیکھنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف ایک فاقہ کش کا بچہ دق میں مبتلا ہوتا ہے، دوا علاج تفریح و آرام کا کوئی سامان نہیں مگر پھر بھی اچھا ہو جاتا ہے کیا اِن روزمرہ کے واقعات سے آدمی پر اپنی بے بسی و بیچارگی اور انسانی عقل و تدبیر کی ناکامی کا اثر نہیں پڑتا؟ ایک صاحب علم دانشمند اور نیکوکار کی ساری زندگی مایوسیوں اور ناکامیوں میں گزرتی ہے، سونے کو ہاتھ لگاتا ہے، تو مٹی ہو جاتا ہے، ہر تدبیر اُلٹی پڑتی ہے بخلاف اس کے اپنے پڑوس ہی میں ایک احمق، جاہل و بدکار کو دیکھتا ہے، کہ دولت و خوش حالی اس کی غلام ہیں اور کامیابیاں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہیں۔ کیا اس عالم یاس میں اس کو ایک اور زندگی اور عالم جزا و سزا سے ڈھارس اور تسکین نہیں حاصل ہوتی؟

غرض ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو اپنی روزانہ زندگی میں ایسے تجربات و حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جو بلا منطقی استدلال و سائنٹفک تحقیقات کے کسی نہ کسی صورت میں اس اعتراف

[۱] (صفحہ ۱۳) خطبات و مقالات "ٹنڈل آر۔ پی بسیرنر۔

واعتقاد پر بے بس کر دیتے ہیں، کہ انسانی ہاتھوں کے اوپر بھی کوئی اور ہاتھ ہے "یداللہ فوق ایدیہم" اور اس عالم شہود کے پردہ میں کوئی نہ کوئی عالم غیب ہے۔ یہ ہی اعتقاد وایمان بالغیب مذہب کی جان ہے۔

خود اہل سائنس اور مادہ پرست ملاحدہ جو اپنے زعم میں "عقل کی فضائے خشک و بلند میں پرواز کرتے ہیں، کیا اس ایمان بالغیب پر مضطر نہیں ہیں؟ کیا کوئی سائنٹسٹ یا مادی قوت، انرجی، نیچر، قانون فطرت، مادہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے بغیر ایک قدم بھی چل سکتا ہے؟ لیکن کیا کوئی پرستار عقل بتا سکتا ہے کہ مادہ، قوت یا نیچر کیا ہے، اِن کی کیا حقیقت ہے؟ سوا اس کے، کہ معلوم واقعات وظواہر کی نامعلوم علت کے لیئے چند مختلف تعبیری الفاظ وضع کر لیئے گئے ہیں، جن کی حقیقت معنوی کی تشریح سے ایک حکیم اسی طرح عاجز ہے، جس طرح ایک اہل مذہب خدا کی تحدید و توصیف سے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک نامعلوم الحقیقت علت کائنات پر غیبی ہی اعتقاد وایمان رکھتے ہیں۔

مثال کے لیئے ایک قانون فطرت (لا آف نیچر) ہی کو لو جو آج کل سائنس اور لٹریچر میں اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ گویا واقعات عالم اور حوادث کائنات کی انتہائی علت اور اصل کنہ کو ہم نے پالیا۔ حالانکہ تجربہ واقعات و حوادث سے ہمارا علم ایک انچ بھی آگے نہیں جاتا۔ اور "قانون فطرت" کے دو لفظی مرکب کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، کہ ایک ہی قسم کے مختلف تجربات، و مشاہدات کا وہ ایک مجموعی یا کلی نام ہوتا ہے، اور بس جس طرح زید، عمر، بکر وغیرہ ایک ہی قسم کے افراد کا کلی نام انسان ہے۔ قانون فطرت ہم کو یہ مطلق نہیں بتاتا کہ فلاں واقعہ کیوں واقع ہوا یا اس کو لازماً اسی طرح واقع ہونا چاہیئے۔ لزوم و وجوب کا راز اب بھی ویسا ہی سر بمہر رہتا ہے، جیسا کہ کسی قانون فطرت کی دریافت سے پہلے تھا۔ ہم اس کی مزید تشریح کی بجائے، خود ایک نامور سائنٹسٹ کا بیان پیش کیئے دیتے ہیں:-

"وہ ڈراؤنا لزوم، وجوب اور "آہنی" قانون کیا ہے، جس نے لوگوں کو اس قدر خائف

اور دہشت زدہ کر رکھا ہی؟ سچ پوچھو تو یہ ہمارے ہی واہمہ کا گڑھا ہوا محض ایک بھوت ہی۔ میرے خیال میں اگر کوئی "آہنی" قانون ہو سکتا ہی، تو وہ قانون کشش ہی، اور اگر طبعی لزوم و وجوب کوئی چیز ہی، تو وہ یہی ہی کہ جب پتھر کے لیئے کوئی روک اور مزاحمت نہ ہو، وہ زمین پر گر پڑیگا۔ لیکن اس واقعہ کی نسبت جو کچھ ہم جانتے ہیں یا جان سکتے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہی؟ صرف اتنی ہی کہ انسانی تجربہ ہمیشہ یہ رہا ہی کہ اس خاص حالت میں، یعنی جب کوئی سہارا نہ ہو، تو پتھر زمین پر گر پڑا ہی، اور ہمارے پاس اس یقین کی کوئی وجہ نہیں ہی، کہ ایسی حالت میں کوئی پتھر زمین پر نہ گر پڑے گا، بلکہ بخلاف اس کے ہم معقول طور پر یقین کر سکتے ہیں، کہ یہ گر ہی پڑیگا۔ البتہ یہ ظاہر کرنے کے لیئے، کہ صورت مذکورہ میں یقین کے تمام شرائط موجود ہیں، اس بیان کا کہ بے سہارے کا پتھر زمین پر گر پڑیگا، قانون فطرت نام رکھ دینا نہایت مناسب و برمحل ہی، لیکن جب "گا" کو ہم "چاہیئے" (یعنی گر پڑیگا کی جگہ پر یہ کہنا، کہ ضرور بالضرور گر پڑنا ہی چاہیئے) سے بدل دیتے ہیں، جیسا کہ علی العموم کیا جاتا ہی، تو ہم لزوم و وجوب کی ایک ایسی زائد شی کا اضافہ کر دیتے ہیں، جس کا نہ تو مشاہدہ واقعات میں نشان ملتا ہی، اور نہ کہیں اور سے پتہ چل سکتا ہی، جہاں تک میری ذات کا تعلق ہی، میں ایسے زبردستی کے دخل در معقولات دینے والوں سے قطعاً اپنی بیزاری اور تبری ظاہر کرتا ہوں۔ بیشک میں واقعہ جانتا ہوں اور اس قانون کا علم رکھتا ہوں مگر یہ لزوم خود اپنے ہی ذہن کے گڑھے ہوئے، غول بیابانی کے سوا اور کیا شی ہی؟"

غرض جس طرح اہل مذہب، واقعات و حوادث کائنات کی ایک معلوم الاسم و نامعلوم المسمّٰی آخری علت (خدا) پر ایمان رکھتے ہیں جس میں چون و چرا کی گنجایش نہیں، اسی طرح منکرین سائنس

لہ مضمون "فزیکل بیسس آف لائف" از ہکسلے۔

بھی انرجی، نیچر، لا آف نیچر" وغیرہ بیسیوں دیوتاؤں کے سامنے خمیدہ سر ہیں، جن کی نسبت چون چرا کا جواب نہیں دے سکتے۔

لا ادری تک جو زبان سے کہتے ہیں کہ ہم کو حوادث محسوسہ یا ظواہر اشیا، کے ماورا چیزوں سے نفیاً و اثباتاً کوئی سروکار نہیں، کیا ان کی خود اس تبری میں اعیان و حقایق کا اعتراف، راز آشکارا کی طرح نمایاں نہیں ہی؟ بقول اسپنسر کے کہ "یہ تصور کرنا ہی سرے سے ناممکن ہی، کہ ہمارا علم صرف ظواہر (۱) تک محدود ہی، بے اس کے کہ ان ظواہر کے پس پردہ کوئی حقیقت تسلیم کی جائے۔ کیونکہ ظاہر بلا باطن ناقابل تخیل ہی"

"کائنات کے ان محسوس ظواہر کی تہ میں جو قایم الذات اور مستغنیٔ الصفات ہستی نہاں ہی، وہ انسانی علم و تخیل سے مافوق ایک نامعلوم و ناممکن العلم قوت ہی جس کی نسبت ہم اس اعتراف پر بے بس ہیں، کہ وہ زمان و مکان کے قیود سے برتر ہی"

اسپنسر کے اس قول کو نقل کر کے سیموئل لینگ لکھتا ہی کہ:-

"یہ بلند ترین فلسفۂ لا ادریت ہی۔ دیکھو کہ یہ الحاد سے ایک بالکل ہی جداگانہ شے ہی، کیونکہ یہ علانیہ ایک پس پردہ قوت کی معترف ہی، جو اگرچہ "نامعلوم و ناممکن العلم" ہی، پھر بھی اُن ہی جذبات و احساسات کی صداے بازگشت ہی جو تمام مذاہب کا سرچشمہ ہیں......"

"مثلاً لا ادریت میں کوئی ایسی شے نہیں ہی، جس کی بنا پر حیاتِ مستقبل کے امکان سے انکار کیا جا سکے۔ پردہ کے پیچھے کون جانتا ہی، کہ کیا ہوتا ہی اور کون کہہ سکتا ہی کہ آدمی کا حس و شعور موت کے بعد نہیں باقی رہتا، یا اُس کا حشر و نشر نہیں ہو سکتا، اور ہماری آیندہ حالت موجودہ اعمال کے مطابق بہتر و بدتر نہیں ہو سکتی۔

(۱) صفحہ ۷۰، آر۔ پی سیریز

معلوم ہوا، کہ فلسفہ کا وہ اسکول بھی، جو آج کل کی دنیائے سائنس میں سب سے زیادہ مقبول ہی، حریفِ مذہب تو کسی طرح بن ہی نہیں سکتا اور اگرچہ لادریت کی زبان نفی و اثبات رد و قبول اور اقرار و انکار دونوں سے ساکت ہی تاہم تم نے دیکھ لیا کہ شیوہائے چشم و ابرو سے اقرار پنہاں پکار پڑتا ہی۔ ع

پرسش ہی اور پائے سخن درمیاں نہیں

بلکہ لادریت کے مخترع اوّل ہکسلے کو اتنا تو اعتراف ہی کرتے بن آیا، کہ لاادری مادہ پرست کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہتا ہی کہ "اگر مجھ کو خالص مادیت و خالص روحیت میں سے کسی ایک کو اختیار ہی کرنا پڑے، تو میں روحیت ہی کے قبول پر مجبور ہونگا"[1]

لیکن ان باتوں سے اِس غلط فہمی میں ہرگز نہ پڑنا چاہیئے، کہ مذہب عقل سے ثابت ہوگیا یا ہو سکتا ہی۔ عقل جس طرح مذہب کے ابطال سے بے بس ہی، اُسی طرح اُس کے اثبات سے بھی۔ اور یہ مذہب کے لیئے کوئی ننگ نہیں، بلکہ اس کے استحکام و عزت کی عین دلیل ہی۔ عقلِ انسانی کے تفاوت و اختلاف کا یہ عالم ہی کہ دنیا میں کوئی موٹی سے موٹی بات بھی ایسی نہیں ہی کہ جس پر تمام عقول و آرا کا اتفاق و اجتماع ہو سکے۔

حرکت سے زیادہ کون سی چیز بدیہی الوجود ہی۔ میں اس وقت جو کچھ لکھ رہا ہوں، وہ جنبش قلم کے بغیر ناممکن ہی۔ پھر بھی ایک حکیم (زینو) کی عقل کہتی ہی کہ نہیں یہ فریب محض ہی۔ اتنا ہی نہیں کہ حرکت ناموجود ہی، بلکہ ناممکن الوجود ہی۔ اور اس پر ایسے دلائل قایم کرتا ہی کہ جواب نہیں بن پڑتا۔ کون شک کر سکتا تھا، کہ سمندر، پہاڑ، آفتاب و ماہتاب، موجودات خارجی نہیں ہیں، لیکن برکلے نے نقارہ کی چوٹ پر کہہ دیا، کہ ذہن سے باہر سرے سے کسی چیز کا

[1] "مجموعۂ مضامین" جز ۵ صفحہ ۲۷۹

بھی وجود نہیں، اور اُس کو کوئی چیں نہ کر سکا۔ کون نہیں جانتا، کہ تناقض محال ہی، مگر ہمارے زمانہ کا ہی ایک مشہور ترین فلسفی (ہیگل) مدعی ہی، کہ تناقض نہ صرف ممکن ہی، بلکہ متحقق ہی، وجود کائنات تناقض ہی پر مبنی ہی۔ تمام دنیا مانتی ہی کہ رشتۂ علت و معلول اٹل ہی۔ آفتاب نکلنے سے گرمی ہی پیدا ہونا چاہیئے، لیکن ہیوم کے اُصول سے یہ بالکل ممکن ہی کہ کل جو آفتاب نکلے وہ برف برسانے لگے۔ وزن ہمیشہ مادہ کی تعریف بلکہ حقیقت میں داخل رہا، مگر اب ایک اور شے شاغل المکان اہل سائنس کو ماننا پڑی، جو ناقابل الوزن ہی۔ یعنی ایتھر جس کی نسبت یہ بھی نہیں معلوم کہ مادہ ہی یا کچھ اور۔

غرض عقل کو خود اپنی گرہ کی عقل نہیں، وہ ہر زمانہ میں بدلتی رہتی ہی۔ ایک ہی زمانہ کے مختلف افراد میں شدید اختلاف ہوتا ہی۔ ایک ہی شخص مختلف حالات و اوقات میں مختلف الآرائے ہو جاتا ہی۔ اس لیئے اگر مذہب اس قدر ناپائدار متزلزل اور متناقض معیار پر پورا اُترنے کا مدعی ہی، تو وہ خود کوئی پائدار و ثابت حقیقت نہیں ٹھہرتا۔ قدیم حکما افلاک کے قائل تھے، تو قرآن میں بھی وہی افلاک آگئے۔ اب وہ حد نظر ثابت ہوگئے تو سیارات کو "سَبْعَ السَّمٰوٰت" بنادیا گیا۔ آگے چل کر اگر یہ سیارات اور ستارے تا بہ نظر کے آخری نقطے ثابت ہوئے، تو قرآن کی آواز بھی ہم آہنگ بنجائیگی۔ قرآن پڑھ کر ارتقا کا خیال بھی مشکل سے گزرتا تھا، ڈارون کے بعد سے تو قرآن بیالوجی کی کتاب بن گئی ہی۔ ہمارے انشا پرداز دوست حضرت مہدی نے کیا خوب کہا کہ "کچھ ابرے سے لیا کچھ استرے سے اور برابر سرابر کردیا۔"

سوچو کہ کیا اس طرح کی تطبیقات یا برابر سرابر کردینے سے مذہب بچوں کا کھلونا نہیں بن گیا؟ حکما و فلاسفہ کی دشمنی سے مذہب کو اتنا نقصان نہیں پہونچا۔ مذہب کے اصلی دشمن اس کے نادان دوست (متکلمین) ہیں۔ میں بلا خوف لومۃ لائم کہنا چاہتا ہوں کہ علم کلام کا بڑا حصہ قطعاً سوخت کردینے کے لائق ہی، یا زیادہ سے زیادہ زبان کا

کی یادگار کے طور پر کسی عجائب خانہ میں مجتمع کر دیا جانے کا مستحق ہی۔

دنیا میں سب سے زیادہ اپنا وقت و دماغ اِس زیاں کاری میں شاید مسلمانوں ہی نے رائیگاں کیا ہی۔ اور افسوس ہی کہ ہندوستان جدید میں سر سید نے اپنی واجب الاعتراف خدمات کے ساتھ ساتھ اِس فتنہ کو بھی جگا دیا۔ اُستاد مرحوم (علّامہ شبلی) نے بھی اِسی آواز میں آواز ملا دی۔ اور اب تو جدید و قدیم تعلیم کے بہتیرے احباب علم و مذہب دونوں کی خدمت کا اہم المقاصد اسی کو جاننے لگے ہیں۔ کاش اُردو زبان کو اِس تریاق نام زہر سے زیادہ مسموم نہ کیا جاتا!

مذہب کے دو جزو ہیں (الف) عقاید اور (ب) اعمال

(الف) خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ عقائد میں داخل ہیں۔ عقل اِن فوق الفطرت چیزوں کا نہ اثبات کر سکتی ہی، نہ ابطال، اور نہ اُس کو اُن کے تسلیم و انکار کا فتویٰ صادر کرنے کا منصب حاصل ہی۔ اِن کا دارمدار تمام تر اعتقاد یا ایمان پر ہی جو انسان کے مختلف فطری احساسات و جذبات سے پیدا ہوتا ہی۔ اِس لیئے، جب تک حیرت و استعجاب، امید و بیم، انعام و انتقام، مایوسی و بے چارگی، ہیبت و جمال پرستی وغیرہ کے احساسات انسان کی فطرت ہیں، اُس وقت تک مذہب بھی اس کی فطرت ہی۔ یا یوں کہو کہ جب تک انسان انسان ہی مذہب سے گریز پائی کا کوئی راستہ نہیں۔ تم، شاخوں کو ہمیشہ چھانٹتے رہو لیکن جب تک جڑ قایم ہی، وہ بھی ہمیشہ نئے برگ و بار لاتی رہیگی۔ غرض جہاں تک اصول مذہب کا تعلق ہی، وہ ایسی بنیاد پر قایم ہیں جو عقل سے کہیں زیادہ استوار و محکم ہی۔ اہل مذہب کی دانائی و فلاح اسی میں ہی کہ ان کی تعمیر کی ایک اینٹ بھی اس بنیاد سے ہلکنے نہ پاوے۔

یہی بھید ہی کہ مذہبی کتابوں میں، جن کے الہامی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہی، منطق کے اشکال و قیاسات اور فلسفیانہ طرز استدلال کا مشکل ہی سے کہیں نشان

ملتا ہی۔ تمام تر اُن ہی احساسات و جذبات کو مخاطب کیا جاتا ہی، جن سے اعتقاد و ایمان کی کیفیت پیدا یا تازہ ہوتی ہی۔ بلکہ الٰہیات (میٹا فزکس) کے مسائل میں عقلی خوض و فکر سے جا بجا اجتناب کی تاکید ہوتی رہتی ہی۔ مسلمان، جو عقائد میں بال کی کھال نکالنے کے سب سے زیادہ شیدائی رہے ہیں، اُن کو آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہیئے کہ خود قرآن نے کیا راہ اختیار کی ہی۔

قرآن خدا کی ہستی کا اعتقاد پیدا کرنے کے لئے زمین و آسمان کے اُن عظیم عجائب پر توجہ دلاتا ہی، جن سے نہ صرف انسانی عقل حیران و ششدر رہ جاتی ہی۔ بلکہ انسانی ارادہ و اختیار سے قطعاً باہر ہوتے ہیں۔ دن رات کا یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے رہنا، آفتاب و ماہتاب کی بندھی ہوئی اور مسخر خدمت گزاریاں، ہواؤں اور بادلوں کی تصریف، نفس یا روح کے نہ سمجھ میں آنے والے افعال :-

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ ..... وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝	کچھ شک نہیں کہ زمین و آسمان کی آفرینش، فرماں بردار ہواؤں اور بادلوں کی زمین و آسمان کے بیچ میں تصریف میں سمجھنے والوں کے لئے یقینی نشانیاں ہیں۔
یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی ذٰلِکُمُ اللّٰهُ لَهُ الْمُلْکُ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝	ارے وہی تو تمہارا خدا ہی صاحب الملک ہی، جو رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہی اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر کر رکھا ہی۔ اپنے نفسوں کے اندر کیا تم کو کچھ نہیں دکھائی دیتا؟

اِن ہی چیزوں کو دیکھ کر آدمی بے ساختہ پکار اُٹھتا ہی کہ "ربنا ما خلقت ھٰذا باطلاً" لیکن ہمارے متکلمین کی خوش فہمی دیکھو کہ وہ ان آیات کی تفسیر میں شرح چغمینی لکھ دیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ ان سے علم ہیئت کی تعلیم مقصود ہی یہ بالکل ایسا ہی ہی

جیسے آج کل کوئی یہ کہنے لگے، کہ "وفی انفسکم افلا تبصرون" سے علم النفس کی تحصیل کا حکم ہی۔ قرآن یا مذہب ان علوم کی تعلیم و تعلّم کا مخالف نہیں ہی، لیکن اس کا کام ان کی تاکید و حمایت بھی نہیں ہی۔ اس کا مقصد صرف ان چیزوں کی عظمت و حیرت انگیزی پر ایک اجمالی اعتقاد یا ایمان پیدا کرنا ہوتا ہی اور بس۔

اسی طرح اگلوں کے قصّے بیان کرنے کی غرض محض عبرت پذیری کے احساس کو اُبھارنا ہوتا ہی۔ مشہور اقوام اور بڑے بڑے فراعنۂ ارض کی ہلاکت و بربادی کی داستانیں بار بار اس لیے دُہرائی جاتی ہیں کہ غافل انسان کو دنیا کی ناپائداری، اپنی بے ثباتی، اور بے بسی کا یقین پیدا ہو آئندہ زندگی کی فکر اور نیکوکاری کا خیال ہو۔ تاریخ کی تحقیق مدعا نہیں ہوتی۔

"افلم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم ولدار الاخرۃ خیر للذین اتقوا افلا تعقلون"	کیا زمین میں وہ نہیں پھرے، کہ دیکھتے اگلوں کا کیا حشر ہوا اور کچھ شک نہیں کہ آخرت کی بہتری پرہیزگاروں ہی کیلیے ہی کیا تمھاری سمجھ میں اتنی بات نہیں آتی

جزا و سزا، نیکوکاری پر انعام کی توقع اور بدکاری پر انتقام کا خوف انسان کا اقتضائے فطرت ہی۔ اس لیئے عَود و حشر کی غرض کے لیئے اِسی جذبۂ فطری کو زیادہ تر مخاطب بنایا جاتا ہی۔

انہ یبدء الخلق ثم یعیدہ لیجزی الذین امنوا وعملوا الصلحت بالقسط والذین کفروا لھم شراب من حمیم وعذاب الیم بما کانوا یکفرون ط	بیشک وہی آفرینش کا آغاز کرتا ہی اور دمرے پیچھے، وہی اعادۂ آفرینش بھی کریگا، تاکہ ایمان والوں اور نیکوکاروں کو پوری پوری جزا دے۔ اور کفر والوں کے لیئے ان کے کفر کی بدولت، گرم پانی اور دردناک عذاب ہوگا۔

غرض الٰہیاتی استدلال (میٹافزیکل ریزننگ) کے بجائے اور عقل نظری کو خطاب کی جگہ مذہب کا روئے سخن زیادہ تر جذبات اور عقل عملی کی طرف

ہوتا ہے۔

بلکہ قرآن نے تو صراحۃً وکنایۃً طرح طرح سے مذہبی عقائد کو فلسفیانہ استدلالات کا کھلونا بنانے سے روکا ہے، اور الٰہیات یا نظری خوض وفکر سے اجتناب کی تعلیم کی ہے۔

اذا رأیت الذین یخوضون فی اٰیاتنا فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکری مع القوم الظالمین ط

جب تو دیکھے، کہ لوگ ہماری نشانیوں میں خوض کرتے ہیں، تو اُن سے الگ رہ یہاں تک کہ وہ اس کی علاوہ کسی اور بات میں خوض کریں۔ اور اگر شیطان تجھ کو یہ حکم بھلادے تو یاد آنے پر ان ظالموں میں ہرگز نہ بیٹھ۔

اور "خوض" فی آیات اللہ کو ظلم قرار دیا۔

فای الفریقین احق بالامن ان کنتم تعلمون الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون ط

کاش تم جانتے کہ فریقین میں سے امن کا کون زیادہ حق دار ہے۔ وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم سے نہیں آلودہ کیا۔ امن وہدایت انہی لوگوں کے لیئے ہے۔

جن لوگوں نے ان فوق الفہم چیزوں کے ایمان واعتقاد کو اپنی کوتاہ رس عقل کے ظلم سے آلودہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ امن اور سکون نفس کی دولت اِن کے نصیب میں نہیں رہی۔

حضرت ابراہیم سے اِن کی قوم نے خدا کے بارے میں محبّت کی، تو جواب ملا کہ "اتحاجونی فی اللہ وقد ھدان" "کیا تم مجھ سے خدا کے باب میں حجت کرتے ہو؟ (یہ بحث حجّت کی چیز ہی نہیں)

لوگوں نے روح کی حقیقت دریافت کی، تو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ "قل الروح من امر ربی" وہ خدا کا ایک امر ہے۔

اِن سب باتوں سے بڑھ کر یہ کہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرنے کی اولین شرط یہ قرار دی گئی کہ ذالک الکتاب لاریب فیه هدی للمتقین الذین یومنون بالغیب (کچھ شبہ نہیں کہ اس کتاب کے اندر اُن ہی لوگوں کے لئے رہنمائی ہے، جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں)۔ ظاہر ہے کہ جو شخص، خدا، روح، وحی والہام وغیرہ کے غیبیات ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو وہ قرآن یا کسی اور مذہبی کتاب سے کیسے رہنمائی حاصل کر سکتا ہے!

کسی موقع پر صحابہ تقدیر کے مسئلہ میں اُلجھ رہے تھے۔ آں حضرتؐ آ پڑے تو آپ کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا، اور فرمایا کہ اگلی قومیں ان ہی باتوں سے تباہ ہوئیں۔

"ان الی ربک المنتھیٰ" کی حدیث میں یہ تفسیر ہے کہ "لا فکرۃ فی الرب" خدا تک "فکر" کی رسائی نہیں۔ عقل انسانی کو یہیں تک پہونچکر رُک جانا چاہیئے۔

اِس نکتہ کو بعض ائمہ دیں نے بھی خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ عقائد کو عقل آرائیوں کا اکھاڑہ نہیں بنایا جاسکتا، یہ صرف ایمان کی چیز ہیں۔ چنانچہ حضرت سفیان و مالک ابن انس وغیرہ فرماتے ہیں کہ "تروی ھذہ الاشیاء یومن بھا ولا یقال کیف؟ یہ باتیں صرف روایت و ایمان کی ہیں، چون چرا کی گنجایش نہیں۔

(ب) عبادات بھی اگرچہ تمام مذاہب کا جز ہیں، لیکن یہ حقیقت میں عقائد ہی کی تفریع اور لازمہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان بالطبع اپنے سے زبردست طاقتوں کے سامنے نیاز و عبودیت کا سر جھکا دیتا ہے، لہٰذا اصولی طور پر مذہب کا دوسرا جز معاملات ہی ہیں جن کا تعلق اخلاقی اور معاشرتی (سوشل) تعلیمات سے ہوتا ہے۔ سچ پوچھو تو سواد اعظم کے لیے مذہب کا یہی حصہ زیادہ اہم، بلکہ اکثروں کے نزدیک، تہذیب اخلاق اور اصلاح و استقامت عمل ہی مذہب کی اصل غایت ہے۔ بالتخصیص قرآن نے تو اس کو اتنی اہمیت دی ہے کہ عمل صالح کو ایمان اور "عملوا الصلحٰت" کو "اٰمنوا" سے جدا ہی نہیں ہونے دیتا۔

لیکن حضرات! یاد رکھنا چاہیئے کہ اعمال و اخلاق کے لئے عقائد اُسی وقت تک

مفید ہیں، جب تک ان کی بنیاد اجمالی اعتقاد یا ایمان بالغیب پر ہی۔ اس لیئے کہ ایمان بالغیب ہی رکھنے والوں کی یہ شان ہی کہ:۔

"انما المومنون اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم"۔ "ایمان والے وہی ہیں جن کے دل خدا کے ذکر سے دہل جاتے ہیں"۔

یہ اعتقاد و ایمان ہی کا وصف ہی کہ "لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن"۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا، کہ ایمان رکھ کر کوئی شخص زنا کا ارتکاب کر سکے۔

کیا مقدمات منطق سے ثابت کیئے ہوئے خدا کا عمل پر یہ اثر پڑ سکتا ہی؟ ارسطو، ابن سینا اور متکلمین اپنے فلسفہ اور علم کلام سے جس واجب الوجود کو ثابت کرتے ہیں، کیا اس کے ذکر سے قلوب پر وہ وجل و ہیبت طاری ہو سکتی ہی، جو ارتکاب معصیت کے وقت بدن میں کپکپی ڈال دے؟ کیا "عقائد نسفی" "شرح مواقف" "تفسیر احمدی (سرسید) اور الکلام (شبلی) کے پڑھنے والوں کے دل میں وہ خشیت الٰہی باقی رہ جاتی ہی جو علم کلام کی ایجاد سے پہلے، خالی متن قرآن کی تلاوت سے حاصل ہوتی تھی؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر کیا اے حضرات "علم کلام" مذہب کا عدوِ مبین نہیں؟ کیا مذہب کے نادان دوست متکلمین، اس کے دانا دشمن ملاحدہ اور مادہ پرستوں سے زیادہ خطرناک نہیں؟ ع

سعدی از دستِ خویشتن فریاد!

اخیر میں صرف اتنا عرض کرنا اور رہ گیا ہی کہ چونکہ عقائد یا مذہب کے الٰہیاتی حصہ کی نسبت خالص الٰہیاتی نقطۂ نظر یا عقل نظری (پیور ریزن) کی رو سے، خطا و صحت کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا، اس لیئے چشم ظاہر کے واسطے مختلف مذاہب میں باہم ترجیح و تفضیل کا منشا، اگر کوئی چیز کسی حد تک قرار پا سکتی ہی، تو وہ معاملات ہی ہیں، یعنی مذہب کا عملی جزو۔ عقائد سے متعلق بھی اگر کچھ رائے زنی جائز ہو سکتی ہی تو وہ بھی اس لحاظ سے

کہ اِنسان کی عملی زندگی کے لئے کس نوع کے اعتقادات، زیادہ سودمند اور بہتر ہیں۔

اِس بحث کو تفصیل کے ساتھ چھیڑنے کا یہ موقع نہیں ہی، کسی دوسری فرصت میں انشاء اللہ اِس پر گفتگو ہوگی۔ البتہ موضوع بحث کی رعایت سے اتنا جان لینا ضروری ہی کہ مذہب کا عملی حصّہ بھی علوم طبعیہ (نیچرل سائنس) کے یقینیات کی زد میں نہیں آتا، ہاں علم المعاشرت (سوشیالوجی) و اقتصادیات (اکنامکس) وغیرہ کے مسائل سے تصادم ہوسکتا ہی اور ہوتا ہی۔

اگرچہ اقتصادیات و معاشرت کے اُصول تمام تر استقرا پر مبنی ہوتے ہیں، جو مختلف مقامات اور زمانوں کے حالات کے ماتحت ہوتے ہیں، اور ان حالات کے اختلاف کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، تاہم بحیثیت مجموعی اور اکثریت کے لحاظ سے اگر کسی مذہب کی عملی تعلیمات کے ردّ و قبول کا معیار عقل ہو سکتی ہی، تو وہ فقط عقل عملی (پریکٹیکل ریزن) ہی، یعنی انسان کی عملی زندگی کے تجربات اور ان سے ماخوذ نتائج و اُصول یا بہ الفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر کوئی علم کلام کارآمد ہوسکتا ہی، تو وجہ علم المعاشرت و اقتصادیات وغیرہ کے مقابلہ میں تیار کیا جائے۔

لیکن ہمارے علمائے مذہب اب تک بالعموم ترکستان کے راستہ پر چلتے رہے ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

خدا کرے آیندہ کعبہ کی راہِ مستقیم کی طرف قدم پڑیں۔

اِس لکچر نے گو کہ قلم بند ہونے کے بعد لکچر سے زیادہ مضمون کی صورت اختیار کرلی ہی پھر بھی ایک خالص مضمون کی چست بیانی اور مطالب کی منطقی ترتیب و تحلیل کی پوری پابندی نہیں

کی گئی ہی تاکہ کم از کم لکچر کے نام کی گنجایش رہ جائے۔ اِس لیئے مناسب معلوم ہوتا ہی کہ ذیل میں اختصار کے ساتھ ساری بحث کا خلاصہ درج کر دیا جائے جس سے مغز سخن ایک نظر میں سامنے آجائے۔

(۱) مقصود بحث "مذہب و عقلیات" میں تطبیق نہیں، بلکہ دونوں کی اختلاف نوعیت اور تباعد حیثیت کی توضیح و تشریح ہی۔

(۲) عقلیات کی دو مختلف اور اہم تقسیمات ہیں :- (۱) سائنس اور (۲) فلسفہ

(۳) مذہب و سائنس کی باہمی نزاع اور اختلاف کا خیال اصل میں علمائے مذہب و اہل سائنس کی معرکہ آرائیوں اور اِسی طرح کی بعض اور غلط فہمیوں سے پیدا ہوا ہی، ورنہ

"حقیقت یہ ہی کہ مذہب و سائنس کے حدود بالکل الگ الگ ہیں۔ سائنس کا جو موضوع ہی مذہب کو اِس سے کچھ واسطہ نہیں، اور مذہب کو جن چیزوں سے بحث ہی سائنس کو ان سے کچھ سروکار نہیں، فلسفہ البتہ کہیں کہیں مذہب سے ٹکراتا ہی لیکن اس کا شمار قطعیات اور یقینیات میں نہیں" (الکلام صفحہ ۱۱)

(۴) فلسفہ اور مذہب میں بے شک تصادم ہو سکتا تھا، لیکن دونوں کی حیثیت بالکل جُدا گانہ ہی۔ فلسفہ کا منشا فوق الفہم چیزوں کے متعلق عقلی موشگافیوں کی تسکین بخشی ہی مذہب جہاں عقل کی رسائی نہیں ایمان و اعتقاد پر بس کرتا ہی۔ اس قسم کا ایمان و اعتقاد کسی نہ کسی صورت میں داخل فطرت ہی۔

(۵) اِس کے علاوہ فلسفہ کے اُصولی مذاہب اربعہ میں اگر کسی کو مذہب کے مخالف کہا جا سکتا تھا، تو وہ صرف مادّیت تھی۔ لیکن مادّیت کی بنا اسی وقت تک استوار تھی، جب تک

لہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہی کہ اُستاد مرحوم علامہ شبلی کی اس دقیق و اہم نکتہ پر نظر تھی، پھر بھی الکلام ہی میں ص ۱۴ مخالف ہی اور تو اور الندوہ کا جو برسوں اُن کی اڈیٹری میں نکلتا رہا، اُس پر جلی قلم سے "تطبیق معقول و منقول" کا مقصد ثبت رہتا تھا اس میں "تطبیق سائنس و مذہب" متعلق خود اُن کے اور اُن کے ارشد تلامذہ کے قلم کے بیسیوں مضامین نکلے ہیں۔

خود ماہیتِ مادہ کے بارے میں گفتگو نہیں چھڑتی تھی۔ مگر اب جب کہ مادہ کی حقیقت کیسی
اِس کا وجود ہی مشتبہ ہوگیا، تو لازماً مادیت کی ساری عمارت زمیں دوز ہوگئی۔

(۶) اِس کشمکش سے بچنے کے لیے دَورِ جدید کے بہت سے حکما و فلاسفہ سے فوق الفطرت (سپرنیچرل) مباحث سے کنارہ کش ہوکر لاعلمی یا لاادریت کی آڑ میں پناہ لینا چاہی۔ لیکن عدم علم عدم وجود کو مستلزم نہیں۔ بلکہ سچ یہ ہی کہ ماورائے ظواہر (اسپنسر) کی نسبت اعتراف لاعلمی ہی میں کسی باطنی حقیقت کا اعتقاد جھلک رہا ہی جس سے حکیم و فلسفی، عالم و جاہل کوئی اپنا دامن نہیں چھڑا سکتا۔

بہ قول **اسپنسر** کے کہ "اگرچہ اس ہستی مطلق کا علم ممکن نہیں، لیکن اس کا ایجابی اور قطعی وجود ہمارے احساس و شعور کا لازمہ ہی، جب تک شعور قایم ہی، اِس سے ایک لمحہ کے لیئے بھی ہم رہائی نہیں حاصل کر سکتے۔ لہذا یہ یقین جس پر نفس شعور کا دارمدار ہی، ہر طرح کے یقین سے ارفع اور بڑھ کر ہی"

اِسی بنا پر جرمنی کا مشہور فلسفی شاعر گیٹے پکار اُٹھا کہ "ذی عقل ہستی (انسان) کی انتہائی سعادت یہی ہی کہ اپنی عقل اُن ہی چیزوں میں دوڑائے جہاں وہ چل سکتی ہی، اور جس شے کی توصیف و تشریح نہیں ہوسکتی، اس کے سامنے خاموشی کے ساتھ سرِ عبودیت جھکا دے"

(۷) مذہب بھی بعینہٖ یہی چاہتا ہی کہ "تفکروا فی الخلق ولا تفکروا فی الخالق" اِس لیئے کھلی بددینی کی منادی کرنے والوں (ملاحدہ) سے کہیں زیادہ وہ حامیانِ دین (متکلمین) دین کے دشمن ہیں جو "تفکروا فی الخالق" کی بدعت کے مذہب کی طرف سے موجد ہیں۔

(۸) علم کلام کی بدولت خود مذہب والوں میں خدا عقل کی شوخیوں اور گستاخیوں کا کھلونا بن گیا، اور "اذا ذکر اللہ وجلت قلوبهم" کا اصلاحِ اعمال و معاملات پر جو اثر تھا

وہ فکر و استدلال کے گڑھے ہوئے خدا کے ذکر میں مفقود ہوگیا۔

(۹) مذہب کے دو حصّوں (۱) عقائد و (۲) اعمال میں سے عقل کے لیئے اگر کچھ گنجائش نکلتی ہی، تو صرف ثانی الذکر میں اس لیئے اگر کسی علم کلام کا وجود کسی حد تک جائز ہو سکتا ہی، تو وہ جس کو صرف اسرارِ اعمال سے بحث ہی، لیکن اعمال میں بھی عقل آخری حَکَم نہیں قرار پا سکتی۔ یعنی جو بات آج خلافِ عقل معلوم ہوتی ہی، اس کا ہمیشہ خلافِ عقل معلوم ہونا، یا فی نفسہٖ نامعقول ہونا ضروری نہیں۔

اس لیئے کہ عقل اور بالتخصیص عقلِ عملی کی حقیقت، جو کچھ ہی، اس کو مولانا حالی کی حکیمانہ زبان سے سُن رکھو ؎

دیکھ عادت کا تسلّط میں نے عادت سے کہا گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے

ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہی مجھ سی الگ میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے